براہینِ قاطعہ

دربارۂ

توحید، رسالت، قیامت

(یعنی توحید، رسالت اور قیامت کے ناقابلِ ردّ دلائل)

از افادات

حضرت اقدس مولانا شاہ عبد الغنی صاحب پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ

مرتّب

شیخ العرب والعجم عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم

کتب خانہ مظہری

گلشن اقبال ۲ کراچی ۴۷
پوسٹ کوڈ ۷۵۳۰۰
فون: ۴۹۹۲۱۷۶

براھینِ قاطعہ

دربارۂ

توحید، رسالت، قیامت

(یعنی توحید، رسالت اور قیامت کے ناقابلِ ردّ دلائل)

از افادات

حضرتِ اقدس مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ

مرتّب

شیخ العرب والعجم عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم

کتب خانہ مظہری

گلشن اقبال ۲، کراچی ۴۷
پوسٹ کوڈ ۷۵۳۰۰
فون: ۴۹۹۲۱۷۶

بہ فیضِ صحبتِ ابرار، یہ دردِ محبت ہے | محبت تیرا صدقہ ہے ثمر تیرے کرم ناز وں کے
بہ اُمیدِ نصیحت دوستو اس کی اشاعت ہے | جو میں یہ نشر کرتا ہوں خزانے تیرے رازوں کے

انتساب

احقر کی جملہ تصانیف و تالیفات

مرشدنا و مولانا محی السنۃ حضرت اقدس شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

اور

حضرتِ اقدس مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

اور

حضرتِ اقدس مولانا شاہ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

کی

صحبتوں کے فیوض و برکات کا مجموعہ ہیں

احقر محمد اختر عفا اللہ تعالیٰ عنہ

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

براھینِ قاطعہ

نقلِ خط حضرت شاہ اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ

بخدمت حضرت شاہ پیر محمد صاحب سلونی (ضلع رائے بریلی، یوپی)

سالک مسلکِ طریقت، واقف مواقفِ حقیقت زاد عرفانہ۔

بعد اھداء سلام مسنون خلاصۃ المرام اینکہ دراین وقت ہمت والا نعمت مصروف بہ استیصال فجرہ دکن است رسیدن ما بدولت اقبال برائے ملاقات آں زبدۃ العارفین خیلے متعسر است اگر خود زیارت پیران خود کہ در دہلی آسودہ ند تشریف آرند استفادۂ برکات از ملاقات آن ملکی صفات کردہ آید۔

والسلام

نقلِ جواب خط

از: حضرت عرفان پناہ شاہ پیر محمد صاحب سلونی (ضلع رائے بریلی)

بنام عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ

شاہاں دیں پناہا فقیر راایں حوصلہ نہ ماندہ۔ ایں دہقانی را با بزمِ سلطانی چہ کار۔ گاہے گاہے کسے از راہے می آید در کریم باز است و کریم ما بے نیاز است کریمے دارم کہ چوں گرسنہ می شوم مہمانی می کند و چوں می خسپم پاسبانی می کند و چوں گناہ می کنم مہربانی۔ کریم ما بس باقی ہوس۔

انتباہ: حضرت والا پھولپوری دامت برکاتہم کو یہ خط حضرت مولانا محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد مولانا محمد حسین صاحب مرحوم پرتاب گڈھی کی بیاضِ خاص سے موصول ہوا۔ حضرت والا نے جس وقت یہ خط پڑھا آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، ایک حالت طاری ہوگئی اور ارشاد فرمایا کہ ان دونوں خطوط کے الفاظ الہامی ہیں اور ہر جملے میں ان حضرات کی نسبت کے انوار نمایاں ہیں اور ارشاد فرمایا کہ اس قدر پاکیزہ اور بافیض تحریر ہے کہ وظیفہ بنالینے کے قابل ہے، انتہی۔

احقر جامع نے برائے افادۂ ناظرین طباعت کی اجازت لے کر اس کتاب کے شروع میں منسلک کردیا۔ اللہ تعالیٰ قبول فرماویں۔

جامع محمد اختر عفا اللہ عنہ

کتابُ التوحید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

أَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ○

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلاً وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ○

قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْ اَنْشَأَهَا اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ○

(سورۃ یٰس، آیات: ۷۹-۷۸-۷۷)

ترجمہ و تفسیر از بیان القرآن: کیا اس آدمی کو جو بعث کا انکار کرتا ہے یہ معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو ایک حقیر نطفہ سے پیدا کیا ہے جس کا مقتضاء تو یہ تھا کہ اپنی اس ابتدائی حالت کو یاد کر کے اولاً بوجہ اپنی حقارت اور خالق کی عظمت کے جرأتِ انکار و گستاخیِ اعتراض سے طبعاً شرماتا، ثانیاً خود اس حالت سے صحت بعث پر عقلاً استدلال کرتا سو اس نے ایسا نہ کیا بلکہ برخلاف اقتضائے مذکورہ علانیہ اعتراض کرنے لگا اور وہ اعتراض یہ کہ اس نے ہماری شان میں ایک عجیب مضمون بیان کیا، عجیب اس لیے کہ اس سے انکارِ قدرت لازم آتا ہے اور اپنی اصل کو بھول گیا کہ نطفۂ حقیر ہے جس سے ہم نے اس کو انسان بنایا ورنہ طبعاً اور عقلاً ایسی بات نہ کہتا اگر اپنی اصل کو نہ بھولتا، کہتا ہے کہ ہڈیوں کو خصوصاً جبکہ وہ بوسیدہ ہوگئی ہوں کون زندہ کرے گا۔ آپ جواب دیجیے کہ ان کو وہ زندہ کرے گا جس نے اوّل باران کو پیدا کیا ہے جبکہ وہ حیات سے بہت بعید تھیں۔ اب تو وہ ایک بار حیات کو بھی قبول کر چکی ہیں اور وہ سب طرح کا پیدا کرنا جانتا ہے۔ ابداء بھی اعادہ بھی اس کو کچھ مشکل نہیں۔ (بیان القرآن، پ:۲۳)

توحید کی دلیل اور عقلی دلائل کی حقیقت

انسان اگر اپنی اوّل پیدائش میں غور کرے تو دوبارہ پیدا ہونے کی دلیل خود اپنی پہلی پیدائش میں مشاہدہ کرے گا۔ اثباتِ توحید و وقوعِ قیامت کے لیے حق تعالیٰ نے قرآن پاک میں متعدد مقامات پر جو دلائل ارشاد فرمائے ہیں وہی ہمارے لیے کافی وافی ہیں۔ حق تعالیٰ کے دین کا کوئی وکیل نہیں بن سکتا، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی سب کے وکیل ہیں۔ خدائے تعالیٰ کے دین کی وکالت بندے کب کر سکتے ہیں۔ دین ایک شاہی محل ہے، اگر اس کی تعمیر میں چماروں کو بھی یہ حوصلہ پیدا ہو کہ ہم اپنی جھونپڑیوں کے سڑے سڑے بانس لگا دیں تو کیا یہ حوصلہ سخت گستاخی پر محمول نہ ہوگا اور کیا بادشاہ کے نزدیک ان چماروں کے یہ ہدایا قابلِ قبول ہوں گے ۔

آرزو می خواہ لیک اندازہ خواہ
می نتابد کوہ را یک برگ کاہ

اسی مثالِ مذکور سے سمجھ لینا چاہیے کہ توحید، رسالت اور قیامت کو اللہ اور رسول نے جن دلائل سے ثابت فرمایا ہے ان کے ہوتے ہوئے ہمیں انہیں دلائل سے کام لینا چاہیے کیونکہ ان اجزاء کا انتخاب شاہی انتخاب ہے اور شاہ کی طرف سے بذریعہ رسول ہم کو عطا ہوئے ہیں اور یہی دونوں دین کے صحیح تعمیری اجزاء ہو سکتے ہیں۔ ہم کیا ہیں اور ہمارا منہ کیا ہے کہ ہم خدا اور رسول کے ارشاد فرمودہ دلائل کے ہوتے ہوئے اپنی سڑی ہوئی اور پھسپھسی عقل کی ٹانگ لڑانے کی جسارت کریں۔ روشن آفتاب کے ہوتے ہوئے دھواں دیتے ہوئے چراغ کی انانیت اور اس کا وجود کیا وقعت رکھتا ہے۔ اسی کو حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

باحضورِ آفتابِ خوش مساغ
رہنمائی جستن از شمع و چراغ
بے گماں ترک ادب باشد ز ما
کفر نعمت باشد و فعلِ ہوا

ترجمہ: آفتابِ خوش رفتار کے نور کے ہوتے ہوئے شمع اور چراغ سے رہنمائی ڈھونڈنا بلاشبہ ہماری طرف سے ترکِ ادب ہے اور نعمتِ نورِ آفتاب کی ناشکری ہے اور یہ محض ایک نفسانی فعل ہوگا۔

آگے مولانا اس فعل نفسانی سے پناہ طلب کرتے ہیں ۔

آفتابا با تو چو قبلہ و امیم
شب پرستی و خفاشی می کنیم
سوئے خود کن ایں خفا شاں را مطار
زیں خفاشی شان بخرائے مستجار

ترجمہ: اے آفتابِ حقیقی! آپ جیسے قبلہ وامام کے ہوتے ہوئے ہم شب پرستی اور خفاشی کررہے ہیں یعنی چمگاڈروں کی طرح ظلمت پسندی میں مبتلا ہیں، آپ ان خفاش طبع انسانوں کو اپنی طرف کرلیجیے اور اس ظلمت پسندی کی خوئے بد سے ان کو نجات عطا فرمادیجیے۔

کیمیا داری کہ تبدیلش کنی
گرچہ جوئے خوں بود نیلش کنی

ترجمہ: اے اللہ! آپ کی رحمت میں عجیب کیمیاوی اثر ہے کہ جس پر آپ اپنی رحمت سے توجہ فرمادیتے ہیں اس کے دریائے خون کو یعنی تمام اخلاقِ رذیلہ کو دریائے نیل سے یعنی اخلاقِ حمیدہ سے تبدیل فرمادیتے ہیں۔

لطف عام تو نمی جوید سند
آفتابت بر حدثہا می زند

ترجمہ: اے اللہ! آپ کا لطفِ عام قابلیت نہیں ڈھونڈتا ہے بلکہ مخلوق کی قابلیت بھی آپ کی عطا ہی پر موقوف ہے۔ آپ کی رحمتِ عامہ کی شان تو یہ ہے کہ آپ کا آفتابِ کرم ظاہری اور باطنی نجاستوں پر بھی اپنا اثر ظاہر کرتا ہے، چنانچہ سرگین یعنی پائخانہ آفتاب کی شعاعوں کے فیض سے خشک ہوکر ایندھن کے کام آتا ہے اور باطنی نجاست یعنی اہلِ کفر اور شرک پر بھی آپ کا آفتابِ کرم رزق کو عام رکھتا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب
گبرو ترسا وظیفہ خور داری
دوستاں را کجا کنی محروم
چونکہ بادشمناں را نظر داری

ترجمہ: اے وہ کریم کہ آپ اپنے خزانۂ غیب سے ہر کافر و مشرک کو وظیفۂ رزق عطا فرماتے ہیں، جب دشمنوں پر آپ کی عطا کی یہ شان ہے تو دوستوں کو آپ بھلا کیسے محروم فرمائیں گے۔

تمام انسانوں کا مبلغ علم انفرادی اور اجتماعی ہر دو حیثیت سے علمِ الٰہی کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّىْ
وَمَا أُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾

(سورۃُ الاسرآء، آیت:۸۵)

ترجمہ و تفسیر از بیان القرآن: اور یہ لوگ آپ سے امتحاناً روح کی حقیقت کو پوچھتے ہیں، آپ جواب میں فرما دیجیے کہ روح کے متعلق بس اتنا

اجمالاً جان لیجیے کہ وہ ایک چیز ہے جو میرے رب کے حکم سے بنی ہے اور باقی اس کی مفصل حقیقت سوتم کو بہت تھوڑا علم بقدر تمہاری فہم کے اور وہ بھی صرف ضروریات کا دیا گیا ہے اور چونکہ اس کا علم ضروریات سے نہیں اور نہ تمہارے فہم میں آسکتا ہے اس لیے مخفی رکھا گیا۔

فائدہ: حضرت مرشدی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام پر بطور فائدہ کے تحریر فرمایا ہے کہ یہاں جو علم کو قلیل فرمایا گیا ہے وہ بہ نسبت علمِ الٰہی کے ہے اور دوسری آیت میں جو علم کو خیر کثیر فرمایا گیا ہے تو وہاں بہ نسبت متاعِ دنیا کے ہے پس دونوں میں تصادم اور تعارض نہ رہا اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قلت صفتِ علم کی یہ اور کثرت صفت خیر کی ہے اور علم اگرچہ قلیل ہو وہ بھی خیرِ کثیر ہے، اس صورت میں تصادم اور تعارض کا شبہ ہی نہیں ہوسکتا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اسی آیت سے یہ بھی استدلال فرمایا ہے کہ اسرارِ غیر ضروریہ کا تفحص و تجسس مذموم ہے جبکہ اس آیت کا مفہوم نھی عن السوال کہا جائے جیسا کہ ظاہر ہے۔ وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا پر جج اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے ایک شعر بہت عمدہ فرمایا ہے ؎

من العلم قلیلاً کو بھی دیکھو بعد اوتیتم
نہ مانو گے تو اک دن بھائیو کھاؤ گے جوتی تم

علمِ الٰہی کے مقابلہ میں بندوں کے رکیک اوہام اور لچر دلائل کی کوئی قیمت اور حیثیت نہیں ہے۔ نصوصِ قطعیہ کے بارے میں اہلِ باطل کا اپنی باطل تاویلات پر اپنے موقف کی بنیاد رکھنے اور ان کے مطمئن ہونے کی مثال ایسی ہے جیسا کہ مولانا روم نے مثنوی شریف میں ایک مکھی اور اس کے تخیلِ خام کی حکایت لکھی ہے۔

مثنوی شریف کی ایک حکایت

وہ قصہ یہ ہے کہ گدھے کے پیشاب میں ایک تنکا بہہ رہا تھا، اس پر ایک مکھی بیٹھی ہوئی مثل کشتی بان کے اپنا سر ہلاتی ہوئی کہہ رہی تھی کہ میں نے ایک مدت تک دریا میں کشتی بانی کا فن سیکھا ہے، اسی کو مولانا فرماتے ہیں ۔

صاحبِ تاویلِ باطل چوں مگس
وہم او بولِ خر و تصویرِ خس

ترجمہ: صاحبِ تاویلِ باطل کی مثال اسی مکھی کی ہے جس کے وہم میں گدھے کا پیشاب دریا معلوم ہوتا ہے اور تنکا اسی پیشاب پر بہتا ہوا کشتی معلوم ہوتا ہے۔ آگے چل کر مولانا باطل پرستوں کی اصلاح فرماتے ہیں ۔

گر مگس تاویل بگذارد ز رائے
آن مگس را بخت گرداند ہمائے

ترجمہ: اگر مگس خصلت باطل پرست انسان اپنی رائے سے تاویلِ باطل کو ترک کردے تو حق تعالیٰ کی رحمت اسے ہما بنا دے، یعنی حق پرستی نصیب ہوجائے۔

انسان کی عقل کب عقلِ کامل ہوتی ہے؟

انسان کی عقل، عقلِ کامل اسی وقت ہوتی ہے جب نورِ وحی سے اس کو تعاون نصیب ہوتا ہے۔ نورِ وحی سے دل کی بینائی درست ہوتی ہے ۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

(اقبالؔ)

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

خیز اے نمرود برجواز کساں
نرد بانے نایدت از کرگساں

نمرود سے یہاں مراد تمام وہ انسانی افراد ہیں جو محض عقل سے بدون امدادِ وحیِ الٰہی خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ بس اے نمرود یعنی اے نمرود خصلت انسان اٹھ اور کسی اللہ والے سے پر طلب کر یعنی تعاون حاصل کر۔ کیونکہ تجھے اپنی ناقص عقل سے یا کسی دوسرے ناقص العقل سے خدا تک رسائی حاصل کرنے کے لیے نردبان یعنی سیڑھی نہ حاصل ہوگی۔ اس میں اشارہ ہے کہ نمرود نے خدا تک پہنچنے کے لیے اور خدا کو دیکھنے کے لیے سیڑھی بنائی تھی اور اس وقت کے پیغمبر حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے استغناء و اعراض ہی نہیں بلکہ عداوت وعناد اختیار کیا تھا۔ اور اس فعل کی شامت نے بالآخر اس کو عذابِ دردناک کی صورت میں آگھیرا۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ۔

حاصل یہ کہ دین کے اصول کی حقانیت پر حق تعالیٰ نے جو دلائل ارشاد فرمائے ہیں وہی اصلی دلائل ہیں اور علماء کے ذمہ انہیں دلائل کو خوش فہمی کے ساتھ عوام پر واضح کرنا فرض ہے۔ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ دلائل عقلیہ ٹوٹ سکتے ہیں کیونکہ ان کا تعلق اس قادرِ مطلق ذات سے ہے جس کے علم اور قدرت کے سامنے تمامی مخلوقات ضعیف اور عاجز ہیں ؎

ہست سلطانی مسلم مرد را
نیست کس راز ہرۂ چوں و چرا

پس دین کا اساسی ستون ہماری اختراعی اور عقلی دلائل سے بے نیاز اور مستغنی ہے۔

زعشق ناتمام من جمال یار مستغنی است

جولوگ اصولِ دین کا موقف نصوصِ الٰہیہ کے علاوہ اپنی ذہنی تمثیلات یا روزمرہ کی سائنسی تحقیقات کو قرار دینا چاہتے ہیں یہ دراصل دوست نما دشمنِ دین ہیں۔ کیونکہ اہلِ سائنس کی نت نئ تحقیقات تبدیل ہوتی رہتی ہیں آئے دن ان کا اعلان ہوتا رہتا ہے کہ مثلاً فلاں چیز کے اندر یہ فوائد تھے لیکن تجربوں سے معلوم ہوا کہ لاکھوں انسان اسی چیز کے ردِّعمل کے نتیجے میں موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اس لیے اب اس کے بجائے کسی دوسری چیز کی تحقیق میں لگ جاتے ہیں اور حق تعالیٰ چونکہ اشیاء کے خالق ہیں اور خالق کو اپنی مخلوقات کے خواص ومزاج کا علم صحیح ہوتا ہے اَلاَ یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ فرماتے ہیں، بھلا وہ نہ جانے جس نے پیدا کیا ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ کے دستور میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِیْلاً اور آپ خدا کے دستور میں ردّ وبدل نہ پائیں گے۔

آج سارے عالم میں جنگ وفساد اور طرح طرح کے مظالم سے انسان کی زندگی دنیا ہی میں جو جہنم کا نمونہ بن چکی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ خدا کے غیر متبدل نظام اور دستور سے اعراض اور روگردانی کر کے عقل کے دستور کی پابندی کر رکھی ہے۔

یہ امر تو تمام عقلاءِ زمان کو تسلیم ہے کہ امن اور عافیت کا مدار قانون پر پابندی ہے۔ جب انسان کی فطرت خیر وشر دونوں کا مجموعہ ہے تو ظاہر ہے کہ شر کے تقاضوں کو روکنے کے لیے اگر قوانین مرتب نہ ہوں اور ان کی عدمِ پابندی پر سزائیں نافذ نہ ہوں تو عالم میں امن کا قیام ناممکن ہے۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ قانون سازی کا حق کس کو ہے؟ اس زمانہ میں الحاد وبددینی کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہمارے نام کے عقلاء زمانہ یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ قانون سازی کا حق درحقیقت کس کو ہے؟ یہ مسئلہ باوجود اپنی بداہت ووضاحت کے نہ سمجھ میں آنے کی وجہ

شدید نفس پرستی ہے۔

چوں غرض آمد ہنر پوشیدہ شد
صد حجاب از دل بسوئے دیدہ شد

یہ کتنا کھلا ہوا اور واضح مسئلہ ہے کہ جس کا ملک ہو اسی کا قانون ہو، خدا کا ملک ہے، اسی کا قانون اصلی قانون ہے، اگر کوئی دہریہ کہے کہ ہم تو خدا کو نہیں مانتے تو ایسے مخاطب سے ہمیں فروعات میں بحث کرنے کا حق نہیں۔ ہمارے مرشد حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ غیر مسلم سے فروعات میں بحث کرنا وقت ضائع کرنا ہے، اس سے اصول میں گفتگو کرنا چاہیے یعنی پہلے خدا تعالیٰ کے وجود پر پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر گفتگو کرنی چاہیے، کیونکہ جب اللہ کو اللہ اور رسول کو رسول تسلیم کرلیا تو اب اس کو جزئیات میں انکار کا راستہ نہیں ملے گا۔ اصول اسلام کو دلائل سے سمجھانا علماء کے ذمے فرض ہے پھر جزئیات کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ مسئلہ قرآن سے ثابت ہے، یہ حدیث سے ثابت ہے۔

ملحدین اور منکرینِ توحید سے قرآن کا طرزِ استدلال

ملحد اور منکر مخاطب سے ہم وہی طرزِ استدلال کا اختیار کریں جس کو حق تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اختیار فرمایا ہے:

﴿ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ ھُمُ الْخٰلِقُوْنَ ﴾

(سورۃ الطور، آیت:۳۵)

یہ لوگ جو توحید کے منکر ہیں تو کیا یہ لوگ بدون کسی خالق کے خود بخود پیدا ہوگئے ہیں یا یہ خود اپنی ذات کے خالق ہیں:

﴿اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ﴾

(سورۃ الطور، آیت:۳۶)

یا یہ کہ نہ اپنے خالق ہیں نہ بلا خالق مخلوق ہوئے ہیں لیکن انہوں نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے۔ اور صفت خالقیت مختصہ باری تعالیٰ میں شریک ہیں۔

(پارہ۲۷، سورۃ طور، از بیان القرآن)

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ملحدین اور مشرکین کو ان تینوں سوالوں کے اندر اس طرح گھیرا ہے کہ قیامت تک اس سے نکل نہیں سکتے ہیں۔ کوئی دہریہ اور ملحد ان تینوں سوالات کا جواب قیامت تک نہیں دے سکتا ہے، ہمارے دلائل ٹوٹ سکتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے استدلال کو کون توڑ سکتا ہے ان آیات کے اندر حق تعالیٰ نے منکرینِ توحید کو یہ بتایا ہے کہ کفر اور شرک کے اختیار کرنے کی جرأت وہی انسان کرسکتا ہے جو (۱) یا تو اپنے کو کسی خالق کا محتاج نہ سمجھے (۲) یا اپنے کو کسی خالق کا محتاج تو سمجھتا ہے مگر خالق اپنے ہی کو مانے (۳) یا یہ کہ اپنے کو کسی خالق کا محتاج تو سمجھتا ہے لیکن اس خالق کو واحد نہ جانے بلکہ کسی دوسرے کو بھی خالقیت میں شریک جانے۔ انہیں تین شقوں میں حق تعالیٰ نے منکرین توحید کو گھیر لیا ہے اور ہر شق کا باطل ہونا انسان کے مشاہدات میں سے ہے۔

بطلانِ شق اوّل: پہلی صورت کہ کیا یہ لوگ بدون کسی پیدا کرنے والے کے خود بخود پیدا ہوگئے ہیں، اس کا باطل ہونا ظاہر ہے کہ انسان ایک وقت میں موجود نہ تھا تو پھر بدون کسی موجِد کے وجود میں آنا عقلاً محال ہے، بقاعدہ عقلیہ ہر ممکن ترجیح وجود میں محتاج مُرجح کا ضرور ہوگا۔ دنیا میں اس کا مشاہدہ موجود ہے کہ کوئی اثر بدون موثر کے اور کوئی حرکت بدون محرک کے اور کوئی فعل بدون فاعل کے اور کوئی معلول بدون علت کے نہیں پایا جاتا ہے اور مشاہدات کا انکار نہیں کیا جاسکتا ہے یہی معنیٰ ہیں حق تعالیٰ کے قول اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ کا۔

بطلانِ شق ثانی: دوسری صورت یہ ہے کہ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ یعنی خود بخود تو نہیں پیدا ہوئے مگر یہ خود ہی اپنی ذات کے خالق ہیں۔ اس صورت کا باطل

ہونا بھی ظاہر ہے کہ ایک ہی شے مخلوق بھی ہو اور وہی اپنی ذات کی خالق بھی ہو ایک ہی شے معلول بھی ہو اور وہی شے اسی جہت سے اپنی علت بھی ہو اس طور پر شے کا اپنے نفس پر تقدم لازم آتا ہے جو عقلاً محال ہے، پس پیدا کرنے والی ذات کا وجود پیدا کی جانے والی ذات سے پہلے ہونا عقلاً ضروری ہے۔

بطلانِ شق ثالث: تیسری صورت یہ ہے کہ یہ منکرینِ توحید خالق کے وجود کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کے تفرد یعنی ایک ہونے کے قائل نہیں ہیں، بلکہ دوسروں کو بھی خالقیت میں شریک سمجھتے ہیں اس کا باطل ہونا بھی ظاہر ہے اس طور پر کہ اَمْ خَلَقُوْا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ کیا ان منکرینِ توحید نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے۔ اسی سوال میں ان کا جواب ہے، کیونکہ جواب نفی میں ہوگا نیز اگر بفرضِ محال دو خالق یا تین خالق تسلیم کر لیے جائیں تو پھر سوال ہوگا کہ ان خالقوں میں سے کوئی عاجز بھی ہوگا یا سب کے سب قادرِ مطلق ہوں گے، اگر کسی کا عاجز ہونا تسلیم کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ کوئی عاجز خدا نہیں ہوسکتا، اور اگر سب کو قادرِ مطلق مانتے ہیں تو اگر ایک خدا نے مثلاً زید کو پیدا کرنا چاہا تو دوسرا خدا اس کے خلاف کا ارادہ کرسکتا ہے یا نہیں، اگر نہیں کرسکتا تو عاجز ہونا لازم آتا ہے اور اگر کرسکتا ہے تو ایک خدا کے ارادہ سے زید کا وجود لازم آتا ہے، اور دوسرے خدا کے ارادہ سے زید کا عدم وجود لازم ہے اور اجتماعِ ضدین عقلاً محال ہے اور جس چیز کے فرض سے محال لازم آتا ہے اس کا وجود عقلاً محال ہوتا ہے پس عقلاً خدا کا ایک ہونا ضروری ہے اسی استدلال کو حق تعالیٰ نے ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا اگر آسمان اور زمین میں متعدد خدا ہوتے تو آسمان و زمین سب تباہ ہو جاتے کیونکہ ایک خدا ایک فعل کا ارادہ کرتا دوسرا اس کے خلاف کا ارادہ کرتا پس جنگ شروع ہو جاتی۔

اگر کوئی مشرک کہے کہ ہر خدا آپس میں صلح و اتفاق سے کام کیا کرے تو

اس کا جواب یہ ہے کہ صلح کی ضرورت اسی وقت ہوتی ہے جب ایک دوسرے کا محتاج ہوتا ہے اور محتاج ہونا منافی الوہیت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ اخلاص میں اَللّٰہُ اَحَدٌ کے بعد اَللّٰہُ الصَّمَدُ فرما کر یہ بتا دیا کہ اَللّٰہُ اَحَدٌ میں جو دعویٰ توحید کیا گیا ہے متصلاً ہی ہم اس کی دلیل بھی بیان فرماتے ہیں وہ دلیل اَللّٰہُ الصَّمَدُ ہے ہماری احدیت کی دلیل ہماری صمدیت ہے۔ کیونکہ اشتراک کا منشاء احتیاج ہوتا ہے اور ہماری ذات احتیاج سے پاک و بے نیاز ہے یہ قرآن کا عجیب اعجاز ہے کہ جہاں دعویٰ ہے وہیں اس کی دلیل ہے اپنی شانِ صمدیت کی اطلاع فرما کر بتا دیا کہ خدا وہی ہوسکتا ہے جو خود تو بے نیاز ہو اور دوسروں کو با نیاز کر دے ؎

سب کو ان کی احتیاج اور وہ ہیں سب سے بے نیاز
واجب اور ممکن کی اک تنویر یہ بھی لاجواب

واضح ہونا چاہیے کہ اصولِ اسلام سب کے سب عقلی ہیں اسی لیے قرآن میں جگہ جگہ اصول کی دعوت کے ساتھ ارشاد ہوتا ہے لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ان باتوں میں دلائل ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں یَعْقِلُوْنَ سے اسی طرف اشارہ ہے کہ اصولِ اسلام سب عقلی ہیں اور فروع کا عقلی ہونا ضروری نہیں۔ البتہ کسی دلیلِ عقلی قطعی کے خلاف نہ ہونا ضروری ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل کے نوجوان طبائع اسلام کے جزئیات اور فروع کو بھی عقل سے سمجھنا چاہتے ہیں اور اصول و فروع میں فرق نہ سمجھنے سے عجب چکر میں پڑ جاتے ہیں جس کا اخیر انجام بددینی ہے۔ (فائدہ از بیان القرآن)

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی ایک کھلی اور عام فہم دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی نے اپنے اپنے زمانۂ نبوت میں توحید کا اعلان فرمایا ہے۔ اگر کوئی خدا اور بھی ہوتا تو وہ

بالیقین ہر زمانے کے نبی سے مقابلہ کرتا اور اگر نہ کرتا تو مُداھن اور بزدل ٹھہرتا۔ صورت اولیٰ ثابت نہیں اور صورت ثانیہ منافی الوہیت ہے اور انسانوں میں سے جس نے مقابلہ کیا نمرود وفرعون وغیرہم کے وہ لوگ بری طرح رسوا اور تباہ ہوئے۔ انبیاء علیہ السلام کے معجزات کے آگے تمام مخلوق عاجز تھی۔ اسی کو حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

صد ہزاراں نیزۂ فرعون را
درشکست آں موسیٰ بایک عصا

ترجمہ: فرعون کے سو ہزار نیزوں کو موسیٰ علیہ اسلام کے ایک عصا نے شکست دے دی۔

صد ہزاراں طب جالینوس بود
پیش عیسیٰ ودمش افسوس بود

ترجمہ: حکیم جالینوس کے سو ہزار طبی نسخے عیسیٰ علیہ اسلام کی ایک پھونک کے آگے ماند پڑ گئے۔

صد ہزاراں دفتر اشعار بود
پیش حرف اُمیش آں عار بود

ترجمہ: شعراءِ عرب کے اشعار کے سو ہزار دفتر اس اُمّی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک حرف کے سامنے شرمندہ ہو گئے ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانۂ چند ملت بہ شست

قانون کی ضرورت

وجودِ صانع اور توحید ثابت ہونے کے بعد اب عقلاً اس امر کا بھی تسلیم کرنا ضروری ہوگا کہ جب ہم مخلوق ومملوک ہیں تو اس خالق اور مالک کا ہمارے

لیے قانون بھی ہونا چاہیے بے قانونی زندگی تو کسی ملک میں رائج نہیں، کوئی حکومت ایسی نہیں ہے جس میں قانون نہ ہو اور عالمِ شہادت یعنی دنیا عالمِ غیب کا نمونہ ہے۔ بے قانون کی زندگی سُور، کتوں اور سانپ بچھو کی ہوتی ہے۔ انسان بحیثیت شرف و عزت انسانیت کے قانون کا محتاج ہے۔ انسانیت کا تقاضا قانون کی ضرورت کو چاہتا ہے۔ کیونکہ انسان کے اندر عقل ہے اور عقل عربی لغت میں عقال سے ہے جس کے معنیٰ رسی کے ہیں۔ پس انسانیت کا جو شرف ہے اس کی حفاظت و بقا کا مدار یہی ہے کہ وہ عقل کی رسی میں بندھا رہے۔

حق تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات پیدا فرمایا ہے یہی وجہ ہے کہ انسان دنیا کی تمام چیزوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ حتیٰ کہ سانپ، ہاتھی، شیر جیسے خوفناک اور خطرناک جانوروں کو بھی مسخر کر لیتا ہے۔ لیکن انسان پر کسی کی تسخیر نہیں جب تمام مخلوقات پر انسان کی تسخیر مشاہد ہے تو اس کی شرافت اور امتیاز کا تقاضا ہے کہ یہ کسی قانون کے تحت رہے کیونکہ بے قانون زندگی جانوروں کی زندگی ہوتی ہے یا پاگلوں کی ہوتی ہے چونکہ اس عالم کو حق تعالیٰ نے امتحان کے لیے پیدا فرمایا ہے اس لیے انسان کے اندر خواہشات پیدا فرمائی ہیں پس اگر ان خواہشات کی روک تھام کے لیے قانون نہ ہو تو تمام عالم میں فساد پیدا ہو جائے کیونکہ انسان پر کسی اور حیوان کو ایسی عقل اور قدرت نہیں دی گئی ہے کہ وہ انسان پر حکمرانی کرے اور اس کو جرائم سے بچائے برعکس انسان، سانپ، بچھو، شیر سبھی موذی اور غیر موذی حیوانات پر قابو حاصل کر کے ان کو جبراً اضرار اور جرائم سے روک سکتا ہے۔ پس عقلاً یہ ثابت ہوا کہ تمام مخلوقات میں صرف انسان کو قانون کا مکلّف کر کے تمام عالم میں امن قائم کیا جا سکتا ہے اور جب یہ بات عقلاً ثابت ہوگئی کہ انسدادِ جرائم اور قیامِ امن اور حفاظتِ شرفِ انسانیت بدون قانون کے ناممکن ہے تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قانون بنائے کون؟

قانون سازی کے بارے میں تین صورتیں ہیں: (۱) ایک انسان تمام بنی نوع انسان میں ایسا منتخب کیا جائے جو سب سے عاقل ہو اور معاشرۂ انسانیت کے صحیح اصول کی تدوین کرے۔ (۲) دوسرے یہ کہ اجتماعی طور پر بہت سے افراد بنی نوع انسان سے منتخب کیے جائیں اور وہ لوگ باہمی مشورہ سے معاشرۂ انسانی کے لیے قانون سازی کریں۔ (۳) تیسرے یہ کہ وہ ذات پاک قانون سازی کرے جو تمام انسانوں کی خالق اور مالک ہے اور انسانی طبائع سے کما حقہٗ واقف و خبردار ہے۔ ان تینوں صورتوں کے علاوہ کوئی اور صورت عقلاً نہیں ہوسکتی۔ اب پہلی اور دوسری صورتوں کے باطل ہونے اور صرف تیسری صورت کی صحت اور حقانیت کو مندرجہ ذیل دلائل سے ثابت کرتا ہوں۔

قانون سازی کا حق صرف خالق کائنات کو ہے

دلیل اوّل: چونکہ ہر انسان کی طبیعت اس کا مزاج اس کی عقل وفہم الگ الگ ہے اس لیے اگر سارے عُقلاء جمع ہوکر باہمی مشورہ سے قانون سازی کرتے تو اختلاف طبیعت، اختلاف مزاج، اختلاف عقل وفہم کے سبب ہر شخص کی رائے کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا لابدی امر تھا اور قاعدہ ہے کہ **اِذَا تَعَارَضَا تَسَاقَطَا** یعنی ہر تعارض میں یہ عقلاً تساقط لازم ہے، پس یہ صورت عقلاً ناممکن ثابت ہوئی نیز چونکہ فطرتِ بشریہ میں خود پسندی، تعلی اور خودرائی کا مرض بھی ہے اس لیے ہر شخص چاہتا ہے کہ میری رائے مقبول ہو کوئی شخص اپنے ہی جیسے بشر سے اپنی رائے کو مسترد اور نامنظور کرنے کو پسند نہیں کرتا۔ پس نتیجہ یہ ہوتا کہ مجلس شوریٰ جوتے بازی اور جنگ وخونریزی کی مجلس بن جاتی ہے۔ چنانچہ کبھی اخباروں میں، اسمبلی ہالوں میں کرسی بازی اور جوتے بازی کی خبریں اسی علت مذکورہ کے تحت نشر ہوا کرتی ہیں۔

دلیل ثانی: دوسری دلیل یہ ہے کہ قانون سازی کے لیے یہ امر ضروری ہے

کہ جن طبائعِ مختلفہ اور امزجۂ مختلفہ کے لیے قانون بنایا جاوے ان طبائع اور امزجہ کی حقیقت کا پورا پورا علم بھی ہو اور اشیاء کی حقائق کا صحیح علم پیدا کرنے والے ہی کو ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بڑے بڑے فلاسفہ نے ادراکِ حقائقِ اشیاء سے اپنا عاجز ہونا ظاہر کر دیا۔ شیخ بوعلی سینا لکھتا ہے کہ نَعَمْ تَنْقِیحُ حَقِیقَةِ الْاَشْیَآءِ عَسِیْرٌ جِدًّا یعنی اشیاء کی حقیقت کی تنقیح یقیناً دشوار ہے۔

جس ذاتِ پاک نے ایک قطرۂ منی کے اندر بینائی، شنوائی، عقل وفہم غصہ وشہوت، بخل وسخاوت، حلم وتواضع جیسے اخلاقِ حمیدہ ورذیلہ کو ودیعت فرمایا ہے وہی ذات پاک ان مادوں کی حکمتوں سے کماحقہٗ علیم وخبیر ہے کہ یہ مادّے کن مقاصد کے تحت پیدا کیے گئے ہیں اپنی مخلوق کے ہر ہر ذرۂ اتصال وانفصال کی حکمت پیدا کرنے والا ہی جان سکتا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ﴾
(سورۃ الملک، آیت: ۱۴)

بھلا وہ ہی نہ جانے جس نے پیدا فرمایا ہے اور وہ باریک بین پورا باخبر ہے۔ جب ہم کسی چیز کو بناتے ہیں تو بنانے سے پہلے اس بننے والی چیز کا مقصد اور اس کی غرض دل میں پیدا ہوتی ہے اور اسی مقصد کے حصول کے لیے ہمارے دل میں اس چیز کے بنانے کا تقاضا پیدا ہوتا ہے پھر اسی مقصد کے لحاظ سے ہم ایسے اجزاء کا انتخاب کرتے ہیں جن اجزاء کی ترتیب وترکیب اس مقصد کو حل کر سکے۔ حق تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو اپنی معرفت کے لیے پیدا فرمایا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾
(سورۃ الذاریات، آیت: ۵۶)

اس آیت میں لِیَعْبُدُوْنِ معنیٰ میں لِیَعْرِفُوْنِ کے ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے یہی تفسیر فرمائی ہے اور اسی تفسیر کو صاحب جلالین نے بھی

لیا ہے، انسان کو پیدا فرمانے سے پہلے انسان کو پیدا کرنے کا یہ مقصد علمِ الٰہی میں متعین تھا پس اسی مقصد کے لحاظ سے انسان کی پیدائش کے لیے ایسے ترکیبی اجزاء حق تعالیٰ کے علم وحکمت نے پیدا فرمائے جو معرفت اور محبت الٰہیہ کے لیے کارآمد ہوسکیں اب ظاہر ہے کہ ان اعضاء انسانیہ کی جس نے تخلیق فرمائی ہے اور جس نے ان کے اندر اخلاقِ حمیدہ ورذیلہ کے مادّے ودیعت فرمائے ہیں وہی ان کے مصارفِ صحیحہ وغیر صحیحہ جانتا ہے۔

نیست باطل ہرچہ یزداں آفرید
از غضب و از حلم و از نُصح مکید

چونکہ انسان اپنی طبیعت اور مزاج کی یقینی حقیقت سے بے خبر ہے اور اطباء کی رائے امزجہ انسانی کے بارے میں محض ظنی ہے یقینی نہیں اس لیے انسان بتقاضائے فطرت وخلقت مجبور اور محتاج ہے کہ اس کے مقصدِ حیات سے اس کو اس کا خالق مطلع کرے اور اس مقصدِ حیات کے لیے اپنے قانون سے بھی مطلع فرماوے۔ حق تعالیٰ خالق ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس انسان کے اندر مثلاً غضب کا مادہ کیوں ہے فلاں میں کس مصلحت سے کم ہے۔ کسی انسان میں کسی رذیلہ کا غلبہ ہے کسی انسان میں کسی رذیلہ کا۔ کوئی غضب کا بیمار ہے تو کوئی شہوت کا بیمار ہے کوئی دونوں کا بیمار ہے۔ جس شخص کو جس نوعِ مجاہدہ سے اپنے تک پہنچانا ہوتا ہے اس کے اندر اسی مقدار سے اس نوع کا مادہ رکھ دیتے ہیں، طُرُقُ الْوُصُوْلِ اِلَی اللّٰہِ بِعَدَدِ اَنْفَاسِ الْخَلَائِقِ۔

کسی کو صبر کی راہ سے پہنچاتے ہیں کسی کو شکر کی راہ سے پہنچاتے ہیں۔ جن سے نبوت ورسالت کا کام لینا ہے ان کی خمیر میں انوار نبوت ورسالت رکھ دیتے ہیں۔ جن کو مجدد بنا کر مبعوث فرماتے ہیں ان کی خمیر میں تجدیدی صلاحیت واستعداد رکھ دیتے ہیں جس انسان کے اندر جو خلق رکھا گیا ہے وہ عبث نہیں

ہے۔مولانا فرماتے ہیں۔

شہوتِ دنیا مثالِ گلخن است
کہ از و حمام تقویٰ روشن است

خواہشاتِ نفسانیہ کے تقاضوں کو جب مرضیاتِ الٰہیہ میں جلا دیا جاتا ہے تو اس سے تقویٰ کے انوار پیدا ہوتے ہیں اور انوارِ تقویٰ سے حق تعالیٰ کی محبت و معرفت نصیب ہوتی ہے اور جب تک ہم کو حق تعالیٰ کی رضامندی اور ناراضگی کا قانون نہ معلوم ہوگا اس وقت تک ہم اپنی ان خواہشات کے صحیح اور غلط دونوں مواقع اور مصارف کے صحیح علم سے واقف نہیں ہوسکتے۔

خلاصہ یہ کہ انسان چونکہ مخلوق ہے اور مخلوق کو نہ اپنی طبیعت و مزاج کا یقینی علم ہوتا ہے نہ دوسری مخلوقات کا اور جب علم نہیں تو ایک ایسا اجتماعی اور ابدی قانون بنانا جس میں ارواح اور اجسام کے تمام مصالح دنیویہ واخرویہ کا پورا پورا لحاظ ہو اور وہ قانون ہو تمام انسانوں کے طبائع و امزجہ مختلفہ کے ساتھ یکساں طور پر موافق ہو کسی مخلوق کے لیے عقلاً ممکن ہی نہیں ہے۔ خواہ مخلوق انفرادی طور پر قانون سازی کرے یا اجتماعی طور پر مجموعہ مخلوق کا مخلوق ہی ہوگا۔

دلیلِ ثالث: تیسری دلیل یہ ہے کہ ہر انسان روحانی مریض ہے، جیسا عنوان ثانی میں بتایا گیا ہے کہ انسان کے اندر مادّۂ غضب و شہوت، بخل و حسد، بغض و کینہ، رکھا گیا ہے اور یہ رذائل دراصل حمام تقویٰ کے لیے ایندھن دیئے گئے ہیں۔ انہیں رذائل کی تہذیب و اصلاح اور امالہ کے لیے انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے جاتے ہیں اور ان کے بعد ان کے سچے نائبین سے کام لیا جاتا ہے۔ اصلاح کی حقیقت ان رذائل کا جڑ سے استیصال و قلع قمع نہیں ہے۔ جو مصلح اپنے طالب میں استیصال رذائل کی کوشش کرے وہ جاہل فقیر ہے وہ حق تعالیٰ کی حکمت کو فوت کرنا چاہتا ہے۔ اگر یہ رذائل بالکل بے کار تھے تو حق تعالیٰ ان کو

پیدا ہی کیوں فرماتے۔ اور استیصال اسی شے کا کیا جاتا ہے جو بے کار ہو۔ اور جو شے من وجہٍ مضر اور من وجہٍ مفید ہو اس شئے سے ضرر کے رُخ کا مفید پہلو کی طرف امالہ کردیا جائے گا۔ ہمارے حضرت مرشد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ازالہ رذائل کا ناممکن ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر تم سنو کسی پہاڑ کے متعلق کہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو تصدیق کرلو لیکن اگر سنو کہ کوئی شخص اپنی جبلت سے ہٹ گیا تو ہرگز تصدیق مت کرو۔ حضرت مرشدی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ دو لفظی ہم قافیہ منجملہ کلیات اشرفیہ کے ہے، ازالہ و امالہ۔ فرمایا کرتے تھے کہ رذائل کا صرف امالہ مطلوب ہے، ازالہ کی فکر کرنا جہل ہے۔ اگر کسی شخص سے غصہ بالکل زائل ہوجائے یا شہوت بالکل زائل ہوجائے تو یہ شخص نامراد ہوجائے گا ایسا شخص نہ کفار سے جہاد کرسکتا ہے نہ اپنے نفس سے جہاد کرسکتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ:

﴿اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ﴾

(سنن الترمذی، کتاب فضائل الجهاد، باب ما جآء فی فضل من مات مرابطًا)

مجاہد وہ ہے جو نفس کی خواہشات سے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے لیے جہاد کرے۔

حاصل یہ کہ ہر انسان روحانی مریض ہے، کوئی شخص دعویٰ نہیں کرسکتا کہ ہم امراضِ روحانیہ سے بالکل پاک وصاف ہیں اور اگر کوئی دعویٰ کرے بھی تو یہ دعویٰ بھی منجملہ ایک روحانی مرض کے ہے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى﴾

(سورۃ النجم، آیت: ۳۲)

ترجمہ: وہ یعنی اللہ تعالیٰ تم کو خوب جانتے ہیں، جب تم لوگوں کو زمین سے پیدا فرمایا تھا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے تو تم اپنے کو مقدس سمجھا مت کرو تقویٰ والوں کو وہی خوب جانتا ہے۔

دوسری جگہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ہمارے حضرت مرشدی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کا یہ ترجمہ فرمایا ہے اور حرص کا نفوس کے ساتھ اقتران ہے۔

اگر ہر انسان اپنے دل کا جائزہ لے تو سینکڑوں عیوب اور امراض اپنے اندر محسوس کرے گا۔ حسد، بغض، کینہ، خود بینی، تکبر، حُبِّ دنیا، حرص وطمع، بخل، ناشکری، بے صبری، ریا، تفاخر، مداہنت، بزدلی، غصہ، شہوت ہر انسان میں یہ مادے کم وبیش ہوتے ہیں اور سالہا سال کے مجاہدات سے ان اخلاق رذیلہ کا اخلاقِ حمیدہ کی طرف صرف امالہ ہوجاتا ہے اور یہی مطلوب ہے۔ بندہ اتنے ہی کا مکلّف ہے ازالہ نہیں ہوتا ہے اور نہ بندہ اس کا مکلّف ہے۔

بخل کا امالہ

امالہ کا مفہوم یہ ہے کہ مثلاً قبل اصلاح نفس پہلے نیک کاموں میں مال کو خرچ کرنے سے بخل کرتا تھا اب وہ اسی قوت سے برے کاموں میں خرچ سے رکتا ہے۔ اگر بخل وامساک کا مادہ ہی نہیں ہوتا تو بُرے کام میں بھی خرچ سے نہ رک سکتا۔

ریا کا امالہ

اسی طرح ریا کا امالہ یہ ہے کہ پہلے مخلوق کو دکھانے کے لیے عبادت کرتا تھا، اب اپنے اللہ میاں کو دکھانے کے لیے عبادت کرتا ہے۔ مادہ وہی ہے مگر مصلحِ کامل نے مصرف بدل دیا۔

امالہ حرص وطمع

اسی طرح حرص وطمع کو دنیا کے لیے صرف کرتا تھا اب مصرف بدل دیا گیا اب اسی حرص وطمع کو حق تعالیٰ کی مرضی حاصل کرنے میں صرف کرتا ہے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہ کی شان میں حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں یَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَاناً۔ یہ لوگ ہماری محبت میں ہماری مہربانی اور خوشنودی کو ڈھونڈتے رہتے ہیں، ہر وقت یہ فکر دامن گیر ہے کہ کونسا ایسا کام کروں کہ میرا اللہ مجھ سے خوش ہوجائے یَبْتَغُوْنَ صیغہ مضارع کا ہے جس میں شان تجدّد استمرار کی ہے۔ اس شان کی رعایت سے ترجمہ یہی ہوگا، یعنی ڈھونڈھتے رہتے ہیں۔

ایک اور اشکال اور اس کا حل

حق تعالیٰ نے اپنے کرم سے ایک عجیب مضمون وارد فرمایا ہے جو اہلِ علم کے لیے نعمتِ عظمیٰ ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیۂ کریمہ کا ترجمہ بھی خوب فرمایا ہے اور حرص کا نفوس کے ساتھ اقتران کردیا گیا ہے۔ اب یہاں کون کہہ سکتا ہے کہ جب نفسانی خواہشات کا ہمارے ساتھ اقتران خدا ہی کی طرف سے ہے تو پھر ہم ان سے کیسے مفر پاسکتے ہیں اور ان امراض نفسانیہ سے صحت یاب کیسے ہوسکتے ہیں تو اس اشکال کا جواب عجیب حق تعالیٰ نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے، قرآن کی ایک آیت کی تفسیر وتسہیل دوسری آیت سے ہوتی ہے ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾

(سورۂ ق، آیت:۱٦)

خواہشاتِ نفسانیہ کا تو اقتران ہی ہے ان خواہشات کو حاضر کیا گیا، جب کہ لفظِ احضار بتا رہا ہے جس میں تمہارا نفع یہ ہے کہ تم سے مجاہدہ کرا کے تم کو درجاتِ قرب سے نواز دینا ہے۔ لیکن ہم تو تمہاری رگِ گردن سے بھی قریب تر ہیں، تمہاری حیات کے موقف سے بھی ہم قریب تر ہیں اور ظاہر ہے

کہ اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ اقرب کا حق زیادہ ہوتا ہے احضار اور قرب کے فرق پر غور کرو اور پھر دیکھو کہ وہ احضار جملہ فعلیہ کے ساتھ ہے جس میں حدوث اور زوال کی توقع ظاہر ہے اور نحن اقرب میں جملہ اسمیہ ہمارے تعلق کے دوام اور استحکام پر کس درجہ دلالت کررہا ہے، نیز ان خواہشات کا علاج بھی حق تعالیٰ نے آسان فرمادیا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾

(سورۃُ التوبۃ، آیت: ۱۱۹)

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کے اے ایمان والو اللہ سے ڈرو۔ اب کوئی سوال کرسکتا ہے کہ میاں ہم آپ سے کس طرح ڈریں ڈرنے کا طریقہ کیا ہے؟

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتادو قاعدہ
اے اسیرانِ قفس میں نو گرفتاروں میں ہوں

حق تعالیٰ متصلاً اس حکم کے بعد فرماتے ہیں ڈرنے کا طریقہ یہ ہے کہ صادقین کی صحبت میں رہ پڑو۔ صادقین فرمایا ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ صدیقین کیوں نہیں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ اس علم عظیم کو حق تعالیٰ نے مجھے اس عمر میں جب کہ اٹھاسی سال میں قدم رکھ چکا ہوں عطا فرمایا ہے، صادقین کے اندر جو صدق ہے ان کی زبان سے بھی اور ان کے ہر عضو سے ہے صدق کے معنی حکایت کرنا مطابق محکی عنہ کے ہر عضو کا صدق الگ الگ ہے آنکھوں کا صدق یہ ہے کہ وہ بری جگہ نگاہ نہ اُٹھائے۔ ہر عضو کا اپنے پروردگار کے مرضی کے مطابق حرکت وسکون اختیار کرنا اس عضو کا صدق ہے اور صدقین بھی انہی صادقین میں ہوتے ہیں مگر یہ کم ہوتے ہیں۔ صدیقیت تو روحانیت کا نام ہے ایک خاص تعلق مع اللہ کا نام ہے۔ ہر صادق صدیق نہیں ہوتا ہے۔

نہ ہر دیدہ را دیدہ بانی دہند
نہ ہر سینہ را راز دانی دہند
برائے سرانجام کار صواب
یکے از ہزاراں شود انتخاب

چونکہ صدیقیت ایک باطنی نعمت کا نام ہے اور اس کا ادراک عامۃ الناس کے لئے مشکل ہے اور تقویٰ کی ضرورت مقتضی عموم کو تھی کیونکہ ہر خاص و عام تقویٰ کا محتاج ہے پس حق تعالیٰ نے صادقین ارشاد فرمایا تاکہ بندوں کو زیادہ کاوش اور محنت شاقہ ان کی تلاش میں نہ ہو صادقین کو ان کے صدق فی القول اور صدق فی العمل سے باآسانی پہچانا جاسکتا ہے یعنی جن بندوں کے اعمال واقوال اور اخلاق مطابق شریعت کے ہوں، وہ سب صادقین ہیں ان کی صحبت اختیار کی جاوے اور انہیں صادقین میں صدیقین بھی کبھی نہ کبھی مل جاویں گے۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہر بُری خواہش کا امالہ ہو جانے سے وہ خواہش محمود ہو جاتی ہے۔

تکبر کا امالہ

تکبر کس درجہ مذموم ہے لیکن اس کا بھی امالہ ہو جانے سے وہ محمود ہو جاتا ہے۔ تکبر کا امالہ یہ ہے کہ پہلے اپنے نفس کو اپنے بھائیوں کے درمیان بڑا سمجھتا تھا اور اکڑ کر چلتا تھا۔ اب اصلاح کے بعد اپنے کو سب سے گنہگار اور حقیر سمجھتا ہے لیکن موقع جہاد میں کافروں کے سامنے اکڑ کر اللہ کی رضا کے لیے تکبر کی چال دکھاتا ہے تاکہ کافروں پر رُعب پڑے۔ اب اگر اس کے اندر تکبر کا مادہ ہی نہ ہوتا تو یہ کیسے اکڑ کر کافروں کو مرعوب کرسکتا۔ چنانچہ حدیثوں میں یہ روایت موجود ہے کہ جب مکہ کے مہاجرین مدینہ میں بیماری سے کمزور ہو گئے تو کفار ان کو کمزور اور حقیر سمجھنے لگے۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم نافذ فرمایا کہ طواف میں کافروں کے سامنے خوب اکڑ کر سینہ نکال کر چلو تاکہ چال سے

دلیری اور قوت ظاہر ہو اور کافروں پر رعب و ہیبت قائم ہو اس وقت میں تکبر اور ریا دونوں رذائل سے کام لیا گیا اسی کا نام مصرف بدل دینا ہے اور اصلاح کا حاصل یہی ہے۔ حضرت مرشدی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ رذائلِ نفسانیہ باعتبار اپنی ذات کے مذموم نہیں کیونکہ یہ مخلوقاتِ الٰہیہ ہیں یہ باعتبار غلط مصرف کے مذموم ہیں۔ اگر ان کا صحیح مصرف کی طرف امالہ کرلیا جائے تو یہی رذائلِ نفسانیہ حق تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اگر ہمارے اندر خواہشات ہی نہ ہوتے تو ہم خدا تک نہ پہنچ سکتے۔ کیونکہ تقویٰ جو شرطِ ولایت ہے انہیں خواہشاتِ نفسانیہ کے ساتھ جہاد سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک نامرد اگر زنا سے بچتا ہے تو اس کا کیا کمال ہے۔ ایک اندھا اگر بدنظری سے بچتا ہے تو اس کا کیا کمال ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نے تحریر فرمایا ہے کہ اگر شہوت و غضب انسان میں نہ ہوتو وہ حق تعالیٰ کے راستے کو قطع نہیں کرسکتا۔ حق تعالیٰ نے اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی جو شدت کافروں کے مقابلے میں ارشاد فرمائی ہے وہ دراصل وہی مادۂ بغض و غضب تھا جو پہلے نفس کے لیے خانہ جنگیوں میں صرف ہوتا تھا اب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پاک نے اس کا امالہ کردیا اور وہی غضب و بغض اللہ کی رضا کے لیے اللہ کے دشمنوں پر صرف ہونے لگا۔ اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

شہوتِ دنیا مثال گلخن است
کہ از و حمام تقویٰ روشن است
نیست باطل ہرچہ یزداں آفرید
از غضب و از حلم و از نصح مکید

خواہشات نفسانیہ کی مثال مثل بھٹی کے ہے تقویٰ کا حمام انہیں سے روشن ہے یعنی خواہشات حق تعالیٰ نے ہمیں بطور ایندھن کے دی ہیں تا کہ ان کو

حق تعالیٰ کی مرضی میں جلا کر تقویٰ کا کھانا پکالیں۔ البتہ اگر کوئی ایندھن ہی کھانے لگے تو ظاہر ہے کہ اس نے مصرف کے غلط ہو جانے سے نقصان اٹھایا نہ یہ کہ وہ شکایت کرے کہ ہمارے اندر یہ خواہشات کیوں رکھ دی گئیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے کسی شے کو عبث نہیں پیدا فرمایا۔ ہر مخلوق میں صدہا حکمتیں پوشیدہ ہیں۔

انہیں امراضِ روحانیہ کی وجہ سے ان کی اصلاح کے سلسلے میں ایک عمر تمام ہو جاتی ہے لیکن موت تک طالبِ صادق تراش خراش میں لگا رہتا ہے۔

اندر ایں رہ می تراش و می خراش
تا دمے آخر دمے فارغ مباش
تا دمے آخر دمے آخر بود
کہ عنایت باتو صاحب سر بود

کوئی بڑے سے بڑا ولی کامل یہ دعویٰ نہیں کرسکتا ہے کہ میرے اخلاقِ رذیلہ بالکلیہ اخلاق حمیدہ سے تبدیل ہو گئے۔ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ حَقَّ تُقَاتِهِ﴾
(سورۃ ال عمران، آیت: ۱۰۲)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اللہ سے ڈرنے کا حق ہے اس آیت کو سنتے ہی حضرات صحابہ رضوانُ اللہ علیہم اجمعین میں غلبۂ خوف و دہشت سے کہرام مچ گیا اور گھبرائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ پاک میں حاضر ہوئے۔ عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق ڈرنے کا ہم سے کیسے ادا ہوسکتا ہے۔ حق تعالیٰ کی رحمت اپنے بندوں کی تڑپ و پریشانی اور خشیت دیکھ کر جوش میں آئی اور اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ اِتَّقُوا اللهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ اپنی استطاعت بھر اللہ سے ڈرتے رہو۔ پس ہر شخص اپنی کوشش میں کوتاہی نہ کرے مرتے دم تک کرتا رہے اور ڈرتا رہے نہ مایوس ہو نہ نڈر رہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد

فرماتے ہیں:

﴿كُلُّ بَنِيْ اٰدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ﴾

(مشکوۃ المصابیح، ص:۲۰۴)

ترجمہ: اے لوگوں! تم سے ہر ایک خطا کار ہے اور بہتر خطا کار وہ ہے جو اپنی خطاؤں سے توبہ کرنے والا ہے۔ اس حدیث میں كُلُّ بَنِيْ اٰدَمَ فرما کر بتا دیا کہ اُمت کا ہر شخص خطا کار ہے۔

پس جب عقلاً و نقلاً یہ بات ہو چکی ہے کہ ہر انسان کے اندر کم و بیش اخلاق رذیلہ ضرور ہوتے ہیں تو یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ ہر انسان نفسانی مریض ہے۔ اب اس میں ایک مقدمہ اور ملا لیا جائے۔ رَأْيُ الْعَلِيْلِ عَلِيْلٌ بیمار کی رائے بیمار ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طبیب جب خود بیمار ہوتا ہے تو دوسرے طبیب کا علاج کراتا ہے۔ اب مقدمات مذکورہ بالا کے پیش نظر یہ نتیجہ ثابت ہوا کہ کوئی انسان مریض ہونے کی حیثیت سے نہ تو اپنی صحت اخلاق کے متعلق قانون سازی کا حق رکھتا ہے اور نہ دوسروں کے لیے اور یہ بیمار رائے بجائے مفید ہونے کے صدہا فتنوں اور مضرتوں کا سبب بن جاتی ہے۔ جیسا کہ روزمرہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں۔

دلیلِ رابع: چوتھی دلیل یہ ہے کہ انسان کو نہ اپنے مستقبل کا علم ہے اور نہ دوسروں کے مستقبل کا اور قانون سازی کے لئے ماضی و حال و مستقبل کا علم ہونا عقلاً ضروری ہے پس ایسا اجتماعی قانون جو تمام آنے والے حوادث اور نئے نئے حالات و انقلابات کے تمام مصالح کو اپنے اندر ملحوظ رکھتا ہو کسی مخلوق کے لئے ممکن نہیں ہے کیونکہ قیامت تک رونما ہونے والے حالات کا علم ہونا تو وہ خالقِ کائنات ہی کو ہوتا ہے۔ اور اگر خالق کو بھی آئندہ کا علم نہ ہو تو وہ خالق ہی نہیں جس کے لئے جہل ثابت ہو۔

انسان کا تو حال یہ ہے کہ موجودہ حالات کے پیش نظر ایک ارادہ یا کوئی رائے قائم کرتا ہے ذرا دیر میں ایسے حالات ناسازگار سے اسے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ اب اسی رائے میں خطرناک پہلو کو مفید پہلو پر غالب دیکھتا ہے۔ بالآخر یہ انسان اپنے مصمم ارادہ کو اور اس پختہ رائے کو توڑ دیتا ہے۔ اور اپنے جہل اور نادانی پر پشیمان ہوتا ہے اور یہ فسخ ارادہ جس طرح سبب خارجی اور مانع خارجی سے ہوتا ہے کبھی کبھی بدون کسی سبب خارجی کے محض ذہنی اور دماغی مقدمات فکر کی ترتیب بدل جانے سے بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر انسان کا خود یہ اپنا مشاہدہ ہے کہ وہ تنہائی میں بیٹھا ہوا بڑے اہتمام سے کسی اہم معاملہ میں غور و فکر کر کے ایک رائے کو صائب اور صحیح سمجھ کر اسی کے مطابق ارادۂ عمل مصمم کر لیتا ہے۔ ذرہ ہی دیر میں بدون کسی خارجی حادثہ و آفت کے محض اس کا ذہن اور تخیّل اس کے اس مفید ارادے پر تنقید شروع کر کے اس کو غلط ثابت کر دیتا ہے۔ روز مرّہ اسی طور پر ہر انسان اپنے اندر کبھی موانع خارجیہ کے سبب کبھی موانع ذہنیہ کے سبب فسخِ ارادہ و تبدیل رائے کا شرمناک واقع دیکھتا رہتا ہے۔ اور اس کو اپنے جہل اور کمزوری کے اس سبق کا تکرار روز مرّہ اس لئے کرایا جاتا ہے کہ انسان اپنے اس ضعف جہل سے اپنے مخلوق ہونے پر اور اپنے محتاج ہونے پر استدلال کر کے وجودِ صانع حقیقی پر ایمان لائے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹ جانے سے اپنے رب کو پہچان لیا۔

اب اگر انسان کی اس کمزوریٔ مذکور کے باوجود اس کے سپرد قانون سازی کا کام کر دیا جاتا ہے تو انجام کار یہ ہوتا کہ وہ قانون ایک تماشہ اور لعبۂ اطفال ہو جاتا۔ کبھی خارجی حوادث سے ٹکرا کر ٹوٹ جاتا، کبھی ذہنی میدان کا گیند بنتا اور نفس پرست انسانوں کے لئے خواہشاتِ نفسانیہ کا بازار گرم کرنے کا

بہترین موقع ہاتھ لگ جاتا پس عقلاً قانون سازی کا حق ایسی ذاتِ پاک کو ہے جسے قیامت تک آنے والے انقلابات وحوادثات کا اختلافِ طبائعِ بشریہ امورِ معاش وامورِ معاد کے جملہ مصالح کا علم کامل ومحیط ہو اس کا علمِ ازلی وابدی تمام مخلوقات کے ماضی وحال ومستقبل سے باخبر ہو یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون میں تغیر وتبدل نہیں ہوتا۔ ارشاد فرماتے ہیں وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا اور آپ اللہ کے دستور میں تبدیلی نہ پائیں گے۔ اب یہاں کوئی کہہ سکتا ہے، بعض احکام آسمانی کتابوں کے جو پہلی اُمتوں کے لئے نازل ہوئے وہ بعد کو باقی نہ رہے۔ ان احکام کے بجائے دوسرے احکام نازل فرمائے گئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا نام تغیر وتبدل نہیں ہے بلکہ اس کا نام نسخ ہے۔

مزاجِ مخاطبین کے تغیر وتبدل کے پیش نظر کسی حکم کو منسوخ کر کے موجودہ مزاجِ اُمت کے مناسب دوسرا قانون نافذ فرمانا عین اقتضاءِ حکمتِ کاملہ ہے۔

تغیر وتبدل کا اطلاق اللہ کے کسی قانون پر عقلاً محال ہے کیونکہ تغیر و تبدل شان حادث کی ہے اور حق تعالیٰ کی ذات پاک قدیم ہے۔ دنیا میں کوئی بادشاہ اپنے قانون میں تغیر وتبدل کب کرتا ہے جب اس قانون کے اندر اس کو کسی ضرر کا علم ہوتا ہے اور اس ضرر کی اصلاح پر وہ قادر نہیں ہوتا اس وقت وہ اس قانون کو تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ دنیا کے حکمرانوں کا قانون آئے دن جو تبدیل ہوتا رہتا ہے اس کی وجہ جہل، عجز وغیرہ ہے۔ یعنی آئندہ ظاہر ہونے والے مضرات سے لاعلمی اور ان کی اصلاح وتدراک سے عاجزی ہے اور حق تعالیٰ کی ذات جہل اور عجز سے پاک ہے، پس عقلاً یہ بات ثابت ہوگئی کہ بجز حق تعالیٰ شانہٗ کے کسی مخلوق کو قانون سازی کا حق حاصل نہیں۔

یعنی ایسے قانون کی تدوین جو تمام مضرتوں سے پاک وصاف ہو بجز خدا تعالیٰ کے کسی مخلوق کو اس پر قدرت نہیں۔

دلیل خامس: پانچویں دلیل یہ ہے کہ انسان ایسے قانون کی تدوین سے جو تمام صفاتِ اُلوہیت کے شایانِ شان ہو مجبور اور عاجز ہے کیونکہ حق تعالیٰ کے جملہ صفات غیر محدود ہیں اور بندوں کے اذہان اور عقول محدود ہیں اور ظاہر ہے کہ محدود ظرف میں غیر محدود کا احاطہ ناممکن ہے۔

اگر حق تعالیٰ ہمیں مطلع نہ فرماتے تو ہمیں ان کی صفات کی معرفت تو درکنار ان کے اسماء کی بھی خبر نہ ہوتی۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ وَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى اور اللہ تعالیٰ کے اور بھی اچھے اچھے نام ہیں جن کی تمہیں خبر بھی نہیں۔ وَلَنِعْمَ مَا قَالَ الْعَارِفُ الرُّوْمِیُّ ؎

اے برون از وہم وقال قیل من
خاک بر فرق من و تمثیل من

دنیا میں اس کا مشاہدہ موجود ہے کے ایک انسان کسی انسان کی خدمت میں ایک عمر معتدبہ گزار دینے کے باوجود بھی کوئی کام ایسا کر گزرتا ہے کہ مخدوم کے مزاج کے بالکل خلاف ہوتا ہے تو ایک بندہ اپنے ہی جیسے ایک انسان کی پوری عمر صحبت کے باوجود اس کی کماحقہٗ مزاج شناسی کا دعویٰ نہیں کرسکتا ہے تو جہاں اتحاد جنسیت کا بھی گذر نہیں جہاں بندے کے افکار واذہان وقیاس اپنی پرواز سے قاصر ہیں لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ جن کی شان ہو ان کی مرضیات اور نا مرضیات کا ادراک کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ بجز اس کے کہ وہ خود اپنے کرم سے پیغمبروں کے ذریعہ ہمیں مطلع فرمادیں اور ہماری اِسی عاجزی اور نقصان عقل وفہم کی وجہ سے ہمارے اوپر حق تعالیٰ شانہٗ نے اس کا بار بھی نہیں رکھا۔ اگر قانونِ ہدایت کی درخواست کا مضمون سورۂ فاتحہ میں خود ہی نازل نہ فرماتے تو

ہمیں تو درخواست پیش کرنے کا بھی سلیقہ نہ تھا۔ ہم اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ جیسے کلمات کہاں سے لاتے۔ ہم سارے انسان اور جن مل کر بھی غور کرتے تب بھی ان کلماتِ حمد وثناء تک ہماری عقل رسا نہ ہوتی۔ ہمیں تو خود اپنی خلقت کے اسرار کی خبر نہیں ہے تو خالق کے صفات کی معرفت کا دعویٰ کس منہ سے کر سکتے۔ پس معلوم ہوا کہ بندوں سے ایسے قانون کی تدوین جو حقوقِ عظمتِ ذات وصفات حق تعالیٰ شانہٗ کے شایانِ شان ہو، ناممکن ہے۔

دلیلِ سادس: چھٹی دلیل یہ ہے کہ ہم جس کے مملوک اور بندے ہیں اسی کا قانون بھی ہونا چاہیے۔ دنیا میں کہیں اس کی نظیر موجود نہیں کہ سلطنت تو کسی اور کی ہے اور قانون کسی اور کا چل رہا ہو۔ جس کی رعایا اسی کا قانون۔ پس اب اس کو عقل سے سوچنا ہے کہ درحقیقت ہم کس کے مملوک ہیں یہ آسمان اور زمین کس کے ہیں۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھّم سے بادسازگار
خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

جس کی ملکیت آسمانوں اور زمینوں میں ہے انہیں کا قانون اصلی قانون ہوگا زمین اور آسمان کا مالک کون ہے، ہے کوئی مدعی جو دعویٰ کرے کہ ہم زمین وآسمان کے مالک ہیں جو ان کا مالک حقیقی ہے انہیں کو دعویٰ مالکیت زیبا دیتا ہے۔

بادشاہی زیبد آں خلّاق را
بادشاہاں جملگی عاجز او را

بادشاہی صرف اس خلّاقِ عالم کو زیبا ہے جملہ شاہانِ دنیا اس کے سامنے عاجز ہیں۔اس کو حق تعالیٰ شانہٗ ارشاد فرماتے ہیں لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اللہ ہی آسمانوں اورزمینوں کا ملک ہے اب یہ سوال ہوتا ہے کہ آسمان اورزمین کے اندر جو مخلوق ہے وہ کس کی مِلک ہیں تو فرماتے ہیں وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور جو کچھ آسمانوں اورزمین کے اندر موجودات ہیں سب اللہ تعالیٰ ہی کی مِلک ہیں۔ جب یہ مقدمات تسلیم ہیں تو جس کا ملک اسی کا قانون۔فرماتے ہیں کہ لَهُ الْمُلْکُ وَ لَهُ الْحُکْمُ اسی کا ملک ہے اور اسی کا قانون اصلی قانون ہے۔اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ کسی کا قانون قانون نہیں بن سکتا وہ کھوٹا سکہ نقلی سونا ہے جس کے ہم غلام ہیں۔اسی ذات پاک کا قانون ہمارے لئے اصلی قانون ہے۔

جب انھیں کی سلطنت ہے۔انھیں کی حکومت ہے۔انہیں کی مملکت تو انھیں کا قانون بھی اصلی قانون ہے۔باقی شاہانِ دنیا کے قانون جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے خلاف رائج ہیں وہ سب کے سب اختراعی اور ذہنی اور نفسانی ہیں اور قرآن کا فیصلہ ہے کہ:

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَo
وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَo
وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَo
(سورۃ المائدۃ)

جو اللہ کے نازل شدہ احکام کے علاوہ کسی اور قانون سے فیصلہ کریں وہ لوگ کافر ہیں، ظالم ہیں، فاسق ہیں۔

یہ چھٹا جواب تعبدی جواب ہے یعنی جب ہم ان کے بندے ہیں تو قانون بھی انہی کا ہونا چاہیے۔ خواہ ان کا قانون ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ دنیا میں ہم سب دیکھتے ہیں کہ آئین نافذ ہوجانے پر ہر شخص اس کی پابندی کو ضروری سمجھتا ہے۔ خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس کی وجہ صرف سزائے نقد ہے۔ جانتے ہیں کہ اگر عمل نہ کریں گے تو مارتے مارتے شل کر دیئے جائیں گے۔ یاد رکھو کہ آخرت کی سزا دردناک بھی نقد ہی ہے۔ دن گزرتے دیر نہیں لگتی۔ ہمارے ایامِ زندگی چپکے چپکے غیر محسوس طور پر کم ہوتے جا رہے ہیں۔

ہو رہی ہے عمر مثلِ برف کم
رفتہ رفتہ چپکے چپکے دم بدم

قانونِ الٰہی کی عظمت وشوکت اور قانونِ مخلوق کا بودہ پن

اگر انسان قانونِ خالق اور قانونِ مخلوق کا مقابلہ کر کے ادنیٰ فکر سے کام لے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ہمارے بنائے ہوئے قانون میں اور اللہ کے قانون میں کیا فرق ہے۔ ہر شئے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ جب باطل کا تقابل حق کے ساتھ ہوتا ہے اس وقت باطل کا بطلان اور لچر پن ظاہر ہو جائے گا۔

حدِّ سرقہ

مثال کے طور پر چوری کی سزا کو لے لیجئے اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو شخص چوری کرے اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ حکمرانِ دنیا جیل خانہ میں ایک مدت ڈال دینے کو کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن تجربہ یہ بتاتا ہے کہ جیل خانہ میں متعدد چور آپس میں تبادلۂ خیالات کر کے اور بھی استاد ہو جاتے ہیں چوری کے فن میں

جو کچھ بھی کمی اور خامی ہوتی ہے اس کی تکمیل جیل خانہ میں ہوجاتی ہے چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ ہر چور جیل خانہ سے نکلتے ہی پھر چوری کرنا شروع کردیتا ہے پس قانون کا جو مقصد انسداد جرائم تھا وہ اس سزا سے حاصل نہ ہوا۔ باطل قانون سے باطل نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ اب حق تعالیٰ کے قانون کا ثمرہ مشاہدہ کیجئے:

(۱)...... جس وقت چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اس وقت خود اس مجرم کو قلب پر آئندہ اس فعل سے توبہ کرنے کا ایک ہی قوی تقاضا تو مرتب ہوتا ہی ہے۔ دوسرے دیکھنے والوں کا دل بھی دہل جاتا ہے۔ اگر کسی کے دل میں کبھی چوری کا وسوسہ وخیال بھی گذر تا رہا ہوگا تو اس سزائے دردناک کو دیکھ کر اس کے دل سے یہ شیطانی خناس ہمیشہ کے لئے نکل جاتا ہے۔

(۲)...... دوسری بات یہ کہ جب مقتوع الید یعنی کٹے ہوئے ہاتھ والا انسان جب کسی محفل میں داخل ہوتا ہے یا کسی راہ سے گزرتا ہے تو لوگ اس سے ہوشیار ہوجاتے ہیں کہ یہ انسان چور ہے اس نے ایک بار چوری کی ہے اس سے بچنا چاہئے۔ اس کے برعکس جیل خانہ میں سزا یافتہ عام انسانوں میں گھل مل جاتا ہے۔ اس سبب سے اس کے ضرر سے بچنا مشکل ہوتا ہے۔

ہر ملک کا انسان سعودیہ عربیہ میں اس قانون پر عمل کرنے کا اثر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ کس درجہ وہاں انسداد جرائم کے سبب امن قائم ہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد

حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے تھے کہ پان کا جو حصہ سڑ جاتا ہے اس کو کاٹ دیا جاتا ہے ورنہ وہ سڑا ہوا حصہ دوسرے صحیح حصہ کو بھی خراب کردیتا ہے۔ پس چور کی یہ سزا خود اس ملزم کے لئے بھی رحمت ہے اور دوسروں کے لیے بھی رحمت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

ارشاد فرمایا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مظلوم کی مدد تو سمجھ میں آتی ہے لیکن ظالم کی مدد کس طرح کریں۔ ارشاد فرمایا کہ ظالم کی مدد کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ظلم کرنے سے روک دیا جائے۔

اسی طرح قانونِ طہارت کا مقابلہ کر کے دیکھئے کہ ہمارے یہاں پاکی کا کس درجہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ پانی سے پہلے پیشاب کے قطروں سے بچنے کے لئے کلوخ کا استعمال کیا گیا ہے پھر پانی سے پاکی حاصل کرتے ہیں۔

طہارت کے مسائل و آداب اس قدر ہیں کہ ہر فقہ کی کتاب میں کتاب الصلوٰۃ سے پہلے کتاب الطہارت کی ایک کتاب ہوتی ہے اور انسانوں کے بنائے ہوئے مروجہ پاکی کے طریقوں کو غور سے دیکھئے کسی کے یہاں کاغذ سے پاخانہ صاف کر کے ٹب میں غسل کے لئے بیٹھ جاتے ہیں پہلے تو نجاست صرف اپنی جگہ پر تھی لیکن اب وہ پانی کے اندر گھل کر آنکھ، ناک، کان، منہ میں بھی داخل ہوگئی۔ کسی کے یہاں ایک گلاس پانی یا ایک چھوٹی سی لٹیا بھی کافی ہو جاتی ہے جس سے پاخانہ اور بھی ادھر اُدھر پھیل جاتا ہے۔ اسی طرح پیشاب کے وقت ایک خاص قسم کا دھاگہ کان میں لپیٹ لیتے ہیں۔ اور پیشاب کی جگہ کو پانی سے نہیں دھوتے۔ یہ عجیب معمہ ہے کہ نجاست خارج ہو جسم کے کسی حصہ سے اور اس کی صفائی کان میں دھاگہ لپیٹ لینے سے ہو۔ یہاں پر ایک دیہاتی مثل خوب یاد آتی ہے کہ ''ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔''

مذہبِ اسلام کی حقانیت کی سب سے بڑی دلیل اس کا قانون ہے۔ قرآن جس طرح مجموعی اعتبار سے معجزہ ہے اسی طرح اس کا ہر قانون معجزہ ہے۔

قرآن ہمارا ایسا قانون ہے کہ اس کو پڑھنے میں بھی لطف ملتا ہے اور

اس کے سننے میں بھی لطف آتا ہے۔ یہ عجیب بات خدا تعالیٰ نے میرے دل میں وارِد فرمائی ہے۔ حکمرانِ دنیا اور مذاہبِ باطلہ اپنے اپنے قانون پڑھ کر سنائیں اور ہمارا قرآن ہمارا قاری ہی پڑھ کر سنائے گا اس وقت اِڈ بِڈ گِڈ بِڈ اور پدم بھونسٹر کی زبان کا اندازہ بھی سامعین کو ہو جائے گا اور قرآن پاک کی دلکش آواز اور اس کی شان و شوکت کا بھی اندازہ سامعین کو ہو جائے گا کیا وجہ تھی کہ کفارِ عرب حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو با آوازِ بُلند تلاوتِ قرآن سے منع کرتے تھے بات یہ تھی کہ قرآن سن کر کافروں کے بیوی بچے مسلمان ہو جاتے تھے۔

بہر حال تقریر ماسبق سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ اور انھیں کا قانون اصلی قانون ہے۔ تو اب اس بات کی ضرورت ہوئی کہ قانون کا کوئی سمجھانے والا بھی ہو اور وہ سمجھانے والا معصوم الفطرت بھی ہو یعنی اس سے کبھی قانونِ الٰہی کے خلاف کوئی کام نہ ہو۔ فرشتہ غیبی اس سلیم الفطرت کامل العقل شخصیت سے قانونِ الٰہی کہہ جائے۔ نیز اس برگزیدہ اور مقدس ہستی کے اندر کوئی ایسی خاص صفت بھی ہو جو دوسرے انسانوں کے اندر اس کو ممتاز کر دے اور اس صفت خاص کی عظمت و شوکت و قدرت کے سامنے تمام مخلوق عاجز ہو اس صفت خاص کا نام معجزہ ہے۔ معجزہ کے معنیٰ عاجز کر دینے والی چیز۔ اصطلاحِ شرع میں اس مقدس شخصیت کو نبی یا رسول کہتے ہیں۔

معجزہ اور جادو کا فرق

جادو میں صرف نظر بندی ہوتی ہے، شے کی حقیقت نہیں بدلا کرتی۔ جادو محض ایک دھوکہ ہوتا ہے اور معجزہ میں شے درحقیقت وہی شے ہو جاتی ہے۔ نظر بندی سے اس کو کچھ تعلق نہیں ہوتا چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے

میں جادوگروں نے جو رسیاں ڈالی تھیں وہ نظر بندی سے سانپ بچھو معلوم ہو رہی تھیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی جب ڈالی تو وہ درحقیقت اژدھا بن گیا اور ان رسیوں کو جو نظر بندی سے سانپ بچھو معلوم ہو رہی تھیں نگل گیا۔ جادوگروں نے اپنے فن کے اعتبار سے حقیقت امر کو سمجھ لیا کہ یہ عصاء موسوی جادو نہیں بلکہ معجزۂ خداوندی ہے پس فوراً سجدہ میں گر گئے اور ایمان لے آئے۔

قانون اور شخصیت

عادۃُ اللہ یہی ہے یعنی اللہ کا یہی دستور رہے کہ ہر زمانہ کے مناسب جب قانون نازل کرنا ہوا تو قانون کے سمجھانے والا پہلے مبعوث فرمایا جس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ نہ تو قانون کی کتاب محض کافی ہے نہ محض شخصیت کافی ہے۔ اگر ان ہر دو ضروری جزوں میں سے ایک کافی ہوتا تو حق تعالیٰ کے دستور پر اعتراض فعلِ عبث کا لازم آتا ہے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت میں یہ بیماری پیدا ہوئی کہ ہمیں صرف قانون کی کتاب کافی ہے شخصیت کی کیا ضرورت ہے تو انہوں نے انبیاء علیہم السلام کا قتل شروع کر دیا۔ اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُمت میں یہ بیماری پیدا ہوئی کہ ہمیں قانون کی کتاب کی کوئی ضرورت نہیں، ہمارے لیے شخصیت کافی ہے تو انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا دیا۔ آج اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی اس قسم کی دو جماعتیں موجود ہیں۔ ایک جماعت صرف لٹریچر کا مطالعہ اپنی ہدایت و رہنمائی کے لیے کافی سمجھتی ہے۔ دوسری جماعت صرف شخصیت کو کافی سمجھتی ہے اور کتاب سے اعراض کرتی ہے۔ یہ دونوں فرقے گمراہ ہیں۔ صراط مستقیم پر وہ جماعت ہے جو عادۃ اللہ یعنی دستورِ الٰہی کے مطابق قانون اور شخصیت دونوں کی ضرورت اور عظمتِ شان کو ملحوظ رکھتی ہے۔

لکھنؤ میں ایک بزرگ مولانا شاہ وارث حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے حضرت امداداللہ صاحب مہاجر مکی کے خلیفہ تھے اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیو بندی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بہت مانتے تھے اپنی مسجد میں ہمارے حضرت کا وعظ بیان کرایا تھا جو الصلوٰۃ کے نام سے طبع ہوا ہے۔ انہی بزرگ کی خدمت میں ایک مولوی صاحب حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت شخصیت اور صحبت کی کیا ضرورت ہے جب کہ ہمارے پاس قرآن اور حدیث کی تعلیمات محفوظ ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اچھا پھر تم صحابی بن جاؤ انہوں نے کہا کہ صحابی بننے کے لیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ضروری ہے۔ تو ان بزرگ نے فرمایا کہ اچھا تابعی بن جاؤ تو مولوی صاحب نے جواب دیا کہ تابعی بننے کے لیے صحابی کی صحبت ضروری ہے۔ پھر ان بزرگ نے فرمایا کہ اچھا پھر تبع تابعی ہو جاؤ۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ تبع تابعی بننے کے لیے تابعی کی صحبت ضروری ہے۔ پھر ان بزرگ نے فرمایا کہ آپ تو کہہ رہے تھے صحبت کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے کتابیں ہمارے لیے کافی ہیں، لیکن آپ خود شروع ہی سے صحبت کی ضرورت ثابت کرتے چلے آرہے ہیں۔ مولوی صاحب نے اسی مجلس میں اقرار کیا کہ بے شک ہم غلط فہمی میں تھے، صحبت نہایت ضروری ہے۔ جج اکبرؔ الٰہ آبادی نے خوب فرمایا ہے ؎

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

جلالتِ شانِ رسالت ﷺ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رحمت

یوں تو ہر نبی اپنی امت کے لیے واسطۂ فیض الٰہی ہوتا ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک کو اس عموم کے ساتھ ایک خصوصی شرف حاصل ہے وہ یہ کہ تمام خلائق کے۔ لیے آپ خود واسطۂ فیضِ الٰہی ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کوئی بھی واسطہ نہیں ہے۔ اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ﴾

(مرقاۃ المفاتیح، کتاب الایمان، باب الایمان بالقدر)

حق تعالیٰ نے تمام مخلوقات میں سب سے پہلے میرے نور کو پیدا فرمایا ہے۔ پس آپ مرکز الخلائق بھی ہیں اور مرکز نبوت و مرکز رسالت بھی ہیں اسی اعتبار سے آپ کو حق تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین فرمایا ہے کیونکہ تمام عالم کے لیے واسطۂ رحمت وہی ہوسکتا ہے جو عنداللہ سب سے افضل اور احب اور اقرب ہو۔

کہاں بزم امکاں میں اے شمع بطحا
کوئی مظہریت میں ہے تیرا ثانی

حق تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین فرما کر یہ بتادیا کہ عرش و کرسی ہفت آسمان و زمین ملائکہ و جن اور تمام بنی نوع انسان اور تمام حیوانات، نباتات، جمادات، یعنی ہر ذرۂ کائنات کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی رحمت ہے۔ کیونکہ عالمین جمع ہے عالم کی اور عالم ہر ماسوائے اللہ کو کہتے ہیں۔ پس آپ تمام موجودات کے لیے رحمت ہیں۔ کافروں کے لیے

بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت ہیں۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی رسمِ بد کو کفارِ عرب نے کافر رہتے ہوئے آپ کے فیضِ تبلیغ سے ترک کر دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر پڑوسیوں کے حقوق مقرر فرما کر قیامت تک کے لیے ان پر اپنی رحمت کو عام فرما دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جن صفاتِ حمیدہ کا پرتو کفار کو بھی فیض پہنچا رہا تھا حق تعالیٰ نے ان کا تذکرہ اس عنوان سے قرآن میں بیان فرمایا ہے:

﴿ لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾

(سورۃُ التوبۃ، آیت: ١٢٨)

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہمارے رحمۃ للعالمین کی شانِ رحمت کا تعلق کفار اور مشرکین کے ساتھ یہ ہے کہ ان کی تکلیف ہمارے رحمۃ للعالمین پر شاق ہے ان کے ایمان پر حریص ہیں اور مومنین کے ساتھ کیسا تعلق ہے؟ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا تعلق کفار اور مومنین کے ساتھ عام ہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رافت کا تعلق مومنین کے ساتھ خاص ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے ایمان لانے پر جس درجہ حریص تھے اس کو حق تعالیٰ نے سورۂ کہف میں اس عنوان سے ارشاد فرمایا ہے:

﴿ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ﴾

(سورۃ الکھف، آیت: ٦)

ترجمہ: سو شاید آپ ان کے پیچھے اگر یہ لوگ اس مضمون پر ایمان نہ لائے تو غم سے اپنی جان دے دیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت سے کس درجہ تعلق ہے اور امت کی نجات کے لیے آپ کو کس درجہ فکر

تھی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صفتِ خاص سے معلوم ہوا کہ تبلیغ کا کام عَلٰی سَبِیْلِ النِّیَابَۃِ انہی اشخاص سے اللہ تعالیٰ لیتے ہیں جو بندگانِ خدا کی ہدایت کے لیے دل میں تڑپ رکھتے ہیں اور اسی تڑپ اور دل سوزی کی وجہ سے مخلوق خدا کی طرف سے ایذاء رسانی اور جور و ستم پر تحمل آسان ہوتا ہے ورنہ بمصداق اس شعر کے نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔

تو بہ ہر زخمے گریزانی زعشق
تو بجز نامے نمی دانی زعشق

(رومی رحمۃ اللہ علیہ)

اے مخاطب تو ہر زخم کی تکلیفِ عشق سے بھاگتا ہے، تو عاشقی کے دستور سے واقف نہیں ہے صرف عشق کا نام جانتا ہے۔

مثنوی شریف کی حکایت

اس مقام کے مناسب مثنوی شریف کی ایک حکایت یاد پڑی۔ وہ یہ کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام قبل ظہورِ نبوت بکریاں چرارہے تھے۔ اتفاق سے ایک بکری حضرت کلیم اللہ کے پاس سے بھاگ گئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پاؤں اس کی تلاش میں دوڑتے دوڑتے پُر آبلہ ہوگیا۔حتیٰ کہ وہ بکری تکان سے سست ہوگئی اور ٹھہر گئی۔تب وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملی پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بکری کی گرد جھاڑی اور اس کی پشت اور سر پر ہاتھ پھیرتے تھے اور ماں کی طرح اس پر نوازش فرماتے تھے اور آدھا ذرہ بھی آپ کو اس بکری پر غصہ اور غیظ نہیں آیا بجز مہربانی اور آبِ چشم کے۔ پھر اس بکری سے حضرت موسیٰ علیہ السلام فرمانے لگے کہ میں نے فرض کیا کہ تجھ کو مجھ پر رحم نہیں آیا لیکن تیری طبیعت نے اپنے اوپر کس لیے ظلم کیا۔یعنی اپنے اوپر تو رحم کرنا چاہیے تھا۔اس وقت ملائکہ سے حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا کہ نبوت

کے لیے فلاں شخص یعنی حضرت کلیم اللہ زیبا ہیں۔ یہ قصہ رعی غنم کا نبوت سے قبل تھا جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ بعد رعی غنم کے جب مدین سے واپس آنے لگے ہیں راستے میں کوہِ طور پر نبوت عطا ہوئی ہے۔ یہاں پر کسی کو شبہ ہوسکتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے تبلیغ کرتے کرتے بالآخر غیظ وغضب کے ساتھ حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ:

﴿رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا﴾

(سورۂ نوح، آیت:۲۶)

اے میرے رب! کافروں میں سے زمین پر ایک باشندہ بھی مت چھوڑ تو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تک تبلیغ کے سلسلے میں قوم کی طرف سے مصائب کا تحمل فرمایا ہے لیکن جب وحی الٰہی سے معلوم ہوگیا کہ اب یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے اس وقت آپ نے یہ دعا فرمائی ہے چنانچہ اس دعا کے بعد ہی عرض کرتے ہیں کہ:

﴿اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا﴾

(سورۂ نوح، آیت:۲۷)

اے اللہ! اگر آپ ان کافروں کو روئے زمین پر رہنے دیں گے تو یہ لوگ آپ کے بندوں کو گمراہ ہی کریں گے اور ان کے محض فاجر اور کافر ہی اولاد پیدا ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحمت کو حق تعالیٰ سورۂ احزاب میں یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ﴾

(سورۃ الاحزاب، آیت:۶)

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مومنین کے ساتھ خود ان کی جانوں سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔

تربیتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قانونِ الٰہی پر عملی مشق جس اسلوب سے فرمائی ہے اس تربیتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح حق تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس طور پر ارشاد فرمائی ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾

(سورۂ ال عمران، آیت: ۱۶۴)

ترجمہ: حق تعالیٰ نے مسلمانوں پر بڑا احسان فرمایا کہ جب کہ ان میں انہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کے دلوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں اور ان کو کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ صریح غلطی میں تھے۔

فائدہ: وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ کا ترجمہ ''اگرچہ اس کے قبل'' کرنا غلط ہے کیونکہ یہاں اِنْ وصلیہ نہیں ہے۔ یہاں پر اِنْ مخفف ہے اِنَّ کا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ کو حق تعالیٰ نے یہاں موقعِ امتنان میں بیان فرمایا ہے اور کس قدر تاکید کے ساتھ بیان فرمایا ہے لام اور قد تاکید کس قدر اہتمام شان امتنان کو ظاہر کر رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ کو ہمیں عطا فرما کر یعنی ہمارے اندر مبعوث فرما کر حق تعالیٰ کا احسان ظاہر فرمانا کس درجہ آپ کی رفعتِ شان پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ بڑے دربار سے جب کوئی نعمت اظہارِ احسان کے ساتھ عطا ہوتی ہے تو وہ درحقیقت اس دربار کی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ قانون جس طرح اللہ تعالیٰ کی

طرف سے انعام ہے اسی طرح یہ قانون جس شخصیت مقدسہ پر نازل کیا جارہا ہے اور جن کے ہاتھوں سے اس قانون پر عملی مشق کی تربیت کرائی جائے گی یعنی حضرت رسول پاک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت مبارکہ بھی تمہارے لیے انعام عظیم ہے جس طرح یہ قانون کی کتاب یعنی قرآن حکیم تمام آسمانی کتابوں کی سردار ہے اور قیامت تک محفوظ رہنے والا معجزہ ہے اسی طرح اس کتاب کی حرمت اور شانِ عظمت کے لحاظ سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اس کتاب کا قاصد اور سفیر مقرر فرمایا گیا جو تمام فرشتوں کے سردار ہیں اور تمام پیغمبروں کے سردار یعنی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کتاب نازل کی گئی۔ اللہ اکبر! کس درجہ اہتمام کیا گیا ہے یہاں سے وہاں تک سیادت کا سلسلہ قائم ہے۔ سید الکتب کو سید الملائکہ کے ذریعہ سید الرسل پر نازل فرمایا ہے۔

﴿وَاِنَّهٗ لَتَنۡزِيۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾

(سورۃ الشعراء، آیت: ۱۹۲)

یہ قرآن کس کا قانون ہے؟ فرماتے ہیں کہ اور یہ قرآن رب العالمین کا بھیجا ہوا ہے۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رب العالمین کے پاس سے اس کتاب کو لانے والا کون ہے تو فرماتے ہیں نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِيۡنُ اس قانون کی کتاب کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے پھر سوال ہوتا ہے کہ کس ذاتِ مبارکہ پر یہ کتاب نازل کی گئی تو فرماتے ہیں عَلٰى قَلۡبِكَ اے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے قلب مبارک پر یہ کتاب نازل کی گئی اب سوال ہوتا ہے کہ یہ کتاب کس مقصد کے لیے نازل فرمائی گئی۔ تو فرماتے ہیں لِتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِيۡنَ تاکہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کتاب کس زبان میں نازل ہوئی ہے تو فرماتے ہیں بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيۡنٍ صاف عربی زبان میں نازل ہوئی ہے۔ وَاِنَّهٗ لَفِىۡ زُبُرِ الۡاَوَّلِيۡنَ اور اس

کتاب کا ذکر پہلی امتوں کی کتابوں میں ہے۔
حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی یعنی اَن پڑھ تھے۔اس میں ایک عجیب راز ہے۔وہ یہ کہ آپ کی ذات پاک تو سید الخلائق تھی اگر مخلوقات سے کوئی آپ کا استاد ہوتا تو استاد ہونے کی حیثیت سے اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر من وجہ سیادت ثابت ہو جاتی پس غیرتِ حق نے آپ کی شانِ سیادت کی حفاظت کے لیے آپ کو اُمّی رکھا اور بدون واسطۂ خلق خود تعلیم فرمائی۔ ارشاد فرماتے ہیں اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ آپ کو رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی۔حق تعالیٰ نے یہاں تعلیم کے لیے اپنے اسماء حسنی میں سے اسم پاک رحمٰن کو بیان فرمایا ہے جس میں اسی بات کی تعلیم ہے کہ معلم پر شان رحمت کا غلبہ ہونا چاہیے۔رحمٰن کی تعلیم سے آپ رحمۃ للعالمین ہو گئے اور رحمۃ للعالمین کی تعلیم سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ہو گئے۔کوئی یہاں پر کہہ سکتا ہے کہ ان کی دوسری صفت اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّار بھی تو ہے جو بظاہر منافی رحمت کے ہے تو اس ظاہری شبہ کا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے کفار کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ ہر کافر اور مشرک اپنے نفس کا ظالم ہے:

﴿وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾

(سورۃ البقرۃ، آیت:۵۷)

اور انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ یہ ملائیے کہ اور ہر ظالم کو ظلم سے باز رکھنا عینِ رحمت ہے خود اس ظالم کے حق میں بھی اور دوسروں کے حق میں بھی۔پس یہ شدت بھی جو کافروں کے ساتھ جہاد میں استعمال کی جاتی ہے عینِ رحمت ہے کبھی مہر بصورتِ قہر ہوتا ہے اسی طرح کبھی قہر بصورتِ مہر ہوتا ہے پس شدت علی الکفار درحقیقت مہر بصورتِ قہر ہے۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام سفیرِ محض تھے معلم نہ تھے

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ سے حق تعالیٰ نے اپنے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعتِ شان کے متعلق بندوں کو مطلع فرمادیا کہ اے لوگو! تم کو یہ شبہ تو نہیں ہوسکتا کہ کوئی انسان ہمارے نبی کا معلم ہو کیونکہ ہمارے رسول کو تم لوگوں نے ظہور نبوت سے پہلے چالیس برس تک دیکھا ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ یہ ان پڑھ یعنی اُمی رسول ہیں۔ لیکن حضرت جبرئیل علیہ السلام کے متعلق کسی کو شبہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے رسول کو تعلیم دی ہو۔ تو واضح ہوجائے کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ درحقیقت ہم نے اپنے رسول اُمی کو تعلیم دی ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام بطور سفیر و قاصد کے ہیں۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ فرما کر اور بھی تاکید فرمادی کہ روح الامین یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام قرآن کو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک لانے والے ہیں، معلم نہیں ہیں۔ رہا یہ شبہ کہ سورۂ نجم میں عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى فرمایا گیا ہے یعنی ان کو ایک فرشتہ تعلیم کرتا ہے جو بڑا طاقتور ہے تو اس آیت میں تعلیم کی نسبت فرشتہ کی طرف کیوں فرمائی ہے۔ تو اس ظاہری شبہ کا جواب ہے کہ یہ نسبت مجازاً کردی گئی ہے۔ چونکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی سفارت سے حق تعالیٰ نے آپ کو قرآن کی تعلیم فرمائی تھی اس لیے اس آیت میں وساطت اور سفارت کا ذکر فرمادیا۔ پس زبان تو جبرئیل علیہ السلام کی تھی اور بولی میاں کی تھی جیسا کہ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ سے اس مفہوم پر دلالت ظاہر ہے عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى کی جو تفسیر حضرت مرشدی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان القرآن میں فرمائی ہے اس کو دیکھنے کے بعد بے حد مسرت ہوئی کیونکہ اس میں میری تقریر کی تائید موجود ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بیان القرآن میں تحریر فرماتے ہیں کہ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى میں حق تعالیٰ شانہٗ نے واسطہ نزولِ وحی کا ذکر فرمایا ہے یعنی ان کو ایک فرشتہ اس وحی کی منجانب اللہ تعلیم کرتا ہے

جو بڑا طاقتور ہے اور اکتساب سے طاقتور نہیں بلکہ پیدائشی طاقتور ہے جیسا کہ ایک روایت میں خود جبرئیل علیہ السلام نے اپنی طاقت کا بیان فرمایا ہے کہ میں نے قوم لوط علیہ السلام کی بستیوں کو جڑ سے اکھاڑ کر آسمان کے قریب جا کر چھوڑ دیا۔ مطلب یہ کہ یہ کلام کسی شیطان کے ذریعہ سے آپ تک نہیں پہنچا کہ کاہن ہونے کا احتمال ہو بلکہ فرشتہ کے ذریعہ سے آیا ہے اور شائد شَدِیْدُ الْقُویٰ کے ساتھ موصوف فرمانے میں یہ مقصود ہو کہ اس کا احتمال بھی نہ کیا جائے کہ شاید اصل میں فرشتہ لے کر چلا ہو مگر درمیان میں کوئی شیطانی تصرف ہو گیا ہو پس اس میں اشارہ ہو گیا جواب کی طرف کہ وہ نہایت شدید القویٰ ہیں شیطان کی مجال نہیں کہ ان کے پاس پھٹک سکے پھر ختم وحی کے بعد خود حق تعالیٰ نے اس کو بعینہٖ ادا کردینے کا وعدہ فرمایا ہے اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہمارے ذمہ ہے آپ کے قلب میں اس قرآن کا جمع کر دینا اور آپ کی زبان سے اس کا پڑھوا دینا۔ (از بیان القرآن، سورۂ نجم، پارہ:۲۷)

پس حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُویٰ میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کا واسطۂ نزول وحی ہونا اور ان کا وحی کی منجانب اللہ تعلیم کرنا تحریر فرمانے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس آیت میں تعلیم کی نسبت جبرئیل علیہ السلام کی طرف بطور سفارت ہے یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام سفیر محض تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معلّم نہ تھے۔ سفیر کی بولی بادشاہ کی بولی سمجھی جاتی ہے۔ حضرت عارف فرماتے ہیں ۔

گرچہ قرآن از لب پیغمبر است
ہر کہ گوید حق نگفت او کافر است

ترجمہ: اگرچہ قرآن ہمیں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے پہنچا ہے لیکن جو شخص یہ کہہ دے کہ کلام حق تعالیٰ کا فرمایا ہوا نہیں ہے وہ کافر ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ ارواح کو عالم ارواح میں جو اجمالی معرفت اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ فرما کر حق تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی اس اجمال کی تربیت بواسطۂ رسول یا نائب رسول یعنی علماءِ ربانین کر کے ارواح کو تفصیلی معرفت عطا فرما دی جائے اسی طرح حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ اور میں نے جن اور انسان کو اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ مجھے پہچان لیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے لِیَعْبُدُوْنِ کی تفسیر لِیَعْرِفُوْنِ سے فرمائی ہے اور اسی تفسیر کو صاحبِ جلالین نے بھی لیا ہے۔ اس ارادہ کے بعد حق تعالیٰ نے مخلوقات کا سلسلہ شروع فرمایا۔ پہلے جب زمین و آسمان کچھ نہ تھا تو حق تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا۔ وَکَانَ عَرْشُہٗ عَلَی الْمَآءِ اس کے بعد چھ دن میں حق تعالیٰ نے زمین اور آسمان کو پیدا فرمایا۔

ایک شبہ اور اس کا حل

یہاں پر اہل علم کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ حق تعالیٰ جب کسی کام کا ارادہ فرماتے ہیں تو کُنْ فرما دیتے ہیں یعنی ہوجا وہ کام ہو جاتا ہے۔ کُنْ فَیَکُوْنُ میں فاءِ تعقیب کے لیے ہے جس سے ارادۂ الٰہی کے بعد ترتب مراد میں تاخیر کسی درجہ میں بھی ثابت نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی قدر تاخیر کا وقوع ہوتا تو فَیَکُوْنُ نہ فرماتے۔ بجائے فاء لفظِ ثُمَّ ہوتا کیونکہ ثُمَّ تاخیر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس شبہ کا جواب میرے دل میں حق تعالیٰ نے یہ وارد فرمایا ہے کہ زمین و آسمان بنے تو چھ دن میں لیکن جو جزءِ آسمان یا زمین کا جس وقت علمِ الٰہی میں بننا تجویز ہوتا صرف اسی حصہ کے لیے اس وقت کُنْ ارشاد ہوتا یہ تاخیر چھ دن کی جو ہوئی تو امر کُنْ کے فرمانے میں تاخیر کے سبب ہوئی۔ ایسا نہیں ہوا کہ امر کُنْ کے فرمانے

کے بعد ترتب مراد میں تاخیر ہوئی ہو۔ جس قدر جس حصہ کو بننے کا حکم ہوتا تھا کہ تو ہو جا اسی وقت اتنا حصہ پیدا ہو جاتا تھا۔

دوسرا شبہ اور اس کا حل

اب یہاں دوسرا شبہ یہ ہوسکتا ہے کہ جب سامنے کوئی مخاطب خارج میں موجود نہ تھا تو کون اس کُن کا مخاطب ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کس سے فرماتے تھے کہ تو ہو جا۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ کُنْ کا مخاطب علم الٰہی میں موجود ہوتا تھا۔ حق تعالیٰ اپنے موجود فی العلم القدیم سے ارشاد فرماتے تھے کہ تو اب خارج میں موجود ہو جا پس حکم الٰہی سے وہ وجود علمی موجود خارجی ہو جاتا تھا۔ یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ جب حق تعالیٰ آن واحد میں زمین وآسمان کی تخلیق پر قادر تھے تو چھ دن میں کیوں پیدا فرمایا تو اس اشکال کا حقیقی جواب یہ ہے کہ رموزِ سلطنت خویش خسرواں دانند۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں
بلبلِ چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

یعنی ہمارا حق کیا ہے کہ ہم باغباں سے پوچھیں کہ بلبل نے کیا کہا اور گل نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا۔ پس حق تعالیٰ کی حکمتوں کا ہماری قلیل المتاع عقل کیونکر احاطہ کرسکتی ہے۔ لیکن منجملہ اور حکمتوں کے ایک حکمت ظاہر ہے کہ اس تدریج میں بندوں کے لیے عملی تعلیم ہے یعنی باوجود قدرت کاملہ کے تدریج اختیار فرما کر ہمیں تعجیل سے بچنے کی تعلیم فرمادی۔

ربوبیت کی تفصیل سے رب العالمین کی معرفت

حق تعالیٰ کی رحمت نے ہمیں پیدا کرنے سے پہلے ہماری تمام

ضروریات کا پہلے ہی سے انتظام فرمایا ہے ؎

مانبودیم و تقاضا ما نبود
لطف او ناگفتۂ مامی شنود

علمِ الٰہی میں یہ بات تھی کہ ہمارے بندوں کو بھوک پیاس لگے گی تو کیا کھائیں گے اور پانی میں کیسے چلیں گے تو فرماتے ہیں:

﴿وَالسَّمَآءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ وَالْأَرْضَ فَرَشْنَاهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ﴾

(سورۃ الذاریات، آیت:۴۸)

اور ہم نے آسمان کو قدرت سے بنایا اور ہم وسیع القدرت ہیں اور زمین کو ہم نے فرش بنایا سو ہم اچھے بچھانے والے ہیں۔ بندوں کے دلوں میں الہام فرمایا کہ ہماری زمین کو ہموار کر کے اس میں بیجوں کو بکھیر دو پھر بادلوں کو پیدا فرمایا اور ان کو حکم فرمایا کہ تم پانی برساؤ، ہواؤں کو حکم فرمایا کہ تم مختلف سمت چل کر کبھی شرقاً کبھی غرباً کبھی شمالاً کبھی جنوباً اپنی مختلف کیفیت حرارت و برودت سے ان بیجوں کی نشو ونما میں اپنا اثر پہنچاؤ۔ ماہتاب کو حکم فرمایا کہ اپنے خاص عروجی ونزولی رفتار سے ان پودوں کی تربیت کرو، آفتاب کو حکم فرمایا کہ تو بھی عزیز علیم کی تقدیر کے مطابق اپنی رفتار خاص سے مختلف درجہ حرارت سے ان پودوں کی نشو ونما کی تکمیل کر اور ان کے خوشوں کو پختہ کر اور نجانے کتنی مخلوقات کو حق تعالیٰ نے ہماری تربیت پر مامور فرما رکھا ہے۔ اسی کو حضرت سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تاتو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار
شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نہ بری

ترجمہ: اے انسان! تیری پرورش کے لیے ابر، ہوا، آفتاب، آسمان سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں تاکہ جب تو ہاتھ میں روٹی لے تو غفلت کے ساتھ اسے نہ کھالے بلکہ یہ سوچ کر کھائے کہ یہ روٹی جو میرے ہاتھ میں اس وقت موجود ہے کتنے مراحل سے گذر کر میرے ہاتھ تک پہنچی ہے، حق تعالیٰ نے اپنی کتنی مخلوقات سے اس روٹی کے لیے کام لیا ہے۔ عالم ارواح میں ربوبیتِ الٰہیہ کی صرف اجمالی معرفت عطا فرمائی گئی تھی اور دنیا میں اسی اجمالی ربوبیت کی تفصیل دکھائی گئی ہے۔ اسی تفصیلی معرفت کے لیے حق تعالیٰ نے بندوں کو سراپا محتاج پیدا فرمایا ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں وَاللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ بظاہر تو اس آیت میں حق تعالیٰ نے بندوں کو اپنا محتاج اور فقیر فرمایا ہے لیکن درحقیقت تاجِ شاہی ہمارے سروں پر رکھ دیا ہے۔ یعنی اس آیتِ کریمہ میں ہمیں یہ بشارت دے دی کہ تمہاری احتیاج وفقر کی پستی سے تم پر ہماری مہربانیاں ہوا کریں گی۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تابر بندگاں جودے کنم

حق تعالیٰ کے جس قدر اسمائے حسنیٰ ہیں وہ دراصل صفات ہیں اور بندوں کو اپنی ہر صفت کا محتاج اس لیے فرمایا ہے کہ بندوں کو جملہ صفاتِ الٰہیہ کی تفصیلی معرفت نصیب ہو جائے۔ ہر حاجت کو اسمائے حسنیٰ الٰہیہ میں سے کسی نہ کسی اسم پاک سے خاص تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً بندوں کے عیوب صفتِ ستاریت کے محتاج ہیں اور ذنوب صفت غفاریت کے محتاج ہیں، ادھر ہم عیب دار ہیں تو وہ ستارالعیوب ہیں، ادھر ہم گنہگار ہیں تو وہ غفارالذنوب ہیں، ہم محتاج رزق ہیں

تو وہ رزاق ہیں، ہم ضعیف ہیں تو وہ قوی ہیں۔ یوں تو کائناتِ عالم کا ذرہ ذرہ ہر وقت اپنے وجود اور بقا میں صفات الٰہیہ کا مظہر ہے لیکن انسان مجموعی طور پر تمام مخلوقات سے زیادہ مظہریتِ صفاتِ الوہیت کا علمبردار ہے، اور اس کے اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ بھی یہی ہے۔

انسان اشرف المخلوقات کیوں ہے؟

انسان کے مظہر اتم ہونے اور اس کے اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ اس کا سب سے زیادہ محتاج اور فقیر ہونا ہے۔ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ فرما کر تمام مخلوقات پر شرف عطا فرمایا ہے۔ ملائکہ کو کھانے پینے کی احتیاج نہیں ہے۔ بظاہر تو فرشتوں کا بھوک پیاس سے بے نیاز ہونا محمود معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت یہ صفت رزاقیت کی تفصیلی معرفت سے عاجز اور مجبور ہیں اور انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ فرما کر یعنی اپنی ہر صفت کا محتاج اور فقیر فرما کر اپنی تمام صفات کا مظہر بنا دیا۔ ہم کن کے فقیر ہیں؟ جو خود بے نیاز ہیں اور سب کو بانیاز کر دینے والے ہیں۔ بندوں کی ہر حاجت کے مناسب حق تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے کسی اسمِ پاک کا پرَتو اور فیض اس حاجت کی حاجت روائی کرتا ہے۔ حق تعالیٰ سورۂ واقعہ، پارہ: ٢٧ میں بطرزِ سوال بندوں پر اپنے کرم اور لطف کا اظہار فرما رہے ہیں:

﴿أَفَرَاَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزَّارِعُوْنَ۝﴾

(سورۃ الواقعۃ، آیات: ٦٣-٦٤)

اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ تم جو کچھ بوتے ہو اس کو تم اُگاتے ہو یا ہم اُگانے والے ہیں:

﴿أَفَرَاَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ۝﴾

(سورۃ الواقعۃ، آیات: ٦٨-٦٩)

اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو اس کو بادل سے تم برساتے ہو یا ہم برسانے والے ہیں:

﴿أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ○ أَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ○﴾

(سورۃ الواقعۃ، آیات: ۷۲-۷۱)

اچھا پھر یہ بتلاؤ جس آگ کو تم سلگاتے ہو اس درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرنے والے ہیں۔

سورۂ انعام میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى﴾

(سورۃ الانعام، آیت: ۹۵)

بے شک اللہ تعالیٰ دانہ اور گٹھلیوں کو پھاڑنے والا ہے۔ یعنی بیجوں کو پھاڑ کر شگوفہ نکالنے والا ہے۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

اللہ نے اپنی ربوبیت میں اپنے کو دکھایا ہے۔ فرماتے ہیں ہماری الوہیت کی دلیل چاہتے ہو؟ ہماری الوہیت کی دلیل تو کائنات کا ہر ذرہ ہے کیونکہ ذرہ میرا ہی پرورده ہے، ہم رب العالمین ہیں، ہم کو اپنے اندر دیکھو، دوسرے انسانوں میں دیکھو، تاروں میں دیکھو، چاند میں دیکھو، آفتاب میں دیکھو، آسمان اور زمین میں دیکھو، پہاڑوں اور سمندروں میں دیکھو۔

کہے دیتی ہے شوخی نقش پاء کی
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے، اتنے دلائل ہوتے ہوئے پھر تم کہاں پھرے جاتے ہو ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ یہ ہے تمہارا رب جس کی تربیت سے تم بول رہے ہو چل رہے ہو۔

خضر کیونکر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

قیامت کب قائم ہوگی؟

یہی وجہ ہے کہ جب روئے زمین پر کوئی اللہ اللہ کہنے والا نہ رہے گا تو قیامت قائم ہو جائے گی یعنی اجسام کی تربیت کے سلسلے میں زمین اور آسمان، سورج اور چاند ستاروں، دریاؤں اور پہاڑوں سے جو کام لیا جا رہا تھا ان کو حکم ہو جاوے گا کہ چونکہ اب میرا نام لینے والا زمین پر کوئی نہیں ہے اس لیے تم بھی اپنا کام بند کردو۔ پس اللہ تعالیٰ کے حکم سے نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا کیونکہ دنیا مقصود نہیں ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاِنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ﴾

(شعب الایمان للبیھقی)

بے شک دنیا یعنی دنیا کی تمام نعمتیں آسمان، زمین، چاند، ستارے، آفتاب، دریا، پہاڑ، سمندر، بری، بحری تمام مخلوقات، حیوانات نباتات جمادات سب تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے، اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو، یہ ساری نعمتیں تمہاری خادم ہیں اور تم اللہ کے خادم ہو، یہ مخلوقات تمہاری چاکری کرتی رہیں گی، بشرطیکہ تم اللہ کی غلامی کرتے رہو۔

ارواح کی تربیت کا مستقل نظام

حق تعالیٰ نے جس طرح اجسام کی تربیت کے لیے قیامت تک کے لیےایک مستقل اور غیر متبدل نظام مذکورہ بالا قائم فرمایا ہے، اسی طرح ارواح کی تربیت کے لیے ایک مستقل نظام قائم فرمایا ہے۔ چونکہ ہر شے کی غذا اس کی لطافت وکثافت کے اعتبار سے جداگانہ ہوتی ہے اس لیے روح جیسی لطیف شے کے لیےلطیف غذاؤں کا انتظام فرمایا ہے۔ حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

نخل خارستاں غذائے آتش است
بوئے گل قوت دماغ سرخوش است

ترجمہ: خاردار درخت آگ کی خوراک ہوتے ہیں اور پھول کی خوشبو پاکیزہ دماغ کی غذا ہوتی ہے۔

جامہ پوشاں را نظر بر گاذر است
روح عریاں را تجلی زیور است

ترجمہ: جامہ پوشوں کی نظر یعنی اہلِ ظاہر کی نظر دھوبیوں پر ہوتی ہے تاکہ ہروقت سفید پوشی رہے اور عریاں روح کے لیے حق تعالیٰ کی تجلیات زیور یعنی سببِ زینت ہیں۔

حق تعالیٰ پودوں کی جڑوں اور تنوں کو اس کی کثافت مزاج کے مطابق کثیف غذا عطا فرماتے ہیں اور کلیوں اور پھولوں کو خوشبو پیدا کرنے والی لطیف غذا عطا فرماتے ہیں۔

جب مادیات کے اندر کثافت اور لطافت مزاج کے اعتبار سے ان کی تربیت کے لیے کثیف اور لطیف غذا کا فرق ہوجاتا ہے تو ارواح تو مادی کثافتوں سے بالکل ہی مجرد ہیں ان کے لیے مادی غذائیں کہاں راس آسکتی تھیں۔ اس

لیے حق تعالیٰ نے ارواح کے لیے اس کی زیادہ لطافت کی مناسبت سے اس کی تربیت کا ایک ایسا مستقل نظام قائم فرمایا جو اس مادی نظام سے بالکل الگ تھلگ ہے اور اس نظام کی باگ جن نفوس مقدسہ کے سپرد فرمائی گئی ان کو انبیاء اور رسل کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ان مقبول بندوں پر اپنے مقرب فرشتوں کے ذریعہ اپنے نورانی احکامات اور تعلیمات کے صحیفے اور کتب کو نازل فرمایا جن کے ذریعہ ان پاکیزہ رجال نے اپنے اپنے زمانوں میں ارواح کی تربیت کا کام انجام دیا۔ تربیت کی تعریف یہ ہے کہ کسی شے کو تدریجاً اس کے درجۂ کمال کو پہنچا دینا۔ روح کی تربیت کا درجۂ کمال یہ ہے کہ اس کے اندر ایسی صلاحیت اور قوت ملکوتیہ پیدا ہو جائے جس سے اس کی اصل آواز نعرۂ لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ہو جائے یعنی دنیا جو ایک امتحان کی جگہ ہے اس کی ظاہر اور فانی نقش و نگار کی اصل حقیقت سے مطلع ہو کر ان سے اعراض کر کے اصل اور حقیقی بہار یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت اور معرفت میں مشغول ہو جائے۔ حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

شد صفیر باز جاں در مرج دیں
نعرہ ہائے لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ

ترجمہ: دین کی چراگاہ میں عارفین کی روحوں کی آواز لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ کے نعرے ہیں یعنی میں فنا ہونے والی مخلوقات سے محبت نہیں کروں گا۔

خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

رنگ رلیوں پہ زمانے کی نہ جانا اے دل
یہ خزاں ہے جو بہ انداز بہار آئی ہے

اور فرمایا ہے کہ ؎

لطف دنیا کے ہیں کے دن کے لیے
کھو نہ جنت کے مزے ان کے لیے

یہ کیا اے دل تو بس پھر یوں سمجھ
تو نے ناداں گل دیئے تنکے لیے

نفس اور شیطان کے برے تقاضوں اور دنیا کے بے ضرورت مشاغل سے ارواح کو نکال کر حق تعالیٰ کی محبت اور معرفت کی طرف جذب کرنا انہیں مقبول اور پاکیزہ بندوں کا کام ہے جو یا تو خود انعامِ نبوت و رسالت سے نوازے گئے ہوں یا ان کی صحبت کے فیض یافتہ ہوں ان حضرات کی روح انوارِ معرفت اور محبتِ الٰہیہ کے فیض سے خود بھی چاہِ دنیا سے آزاد ہوتی ہے اور اپنے فیضِ محبت سے دوسری محبوس روحوں کو بھی چاہِ دنیا سے نکال لیتی ہے۔ اگر یہ خود چاہِ دنیا سے نکلے ہوئے نہ ہوتے تو دوسروں کو کب آزاد کرا سکتے تھے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

کے دہد زندانیے در اقتناص
مرد زندانی دیگر را خلاص

ایک قیدی جو خود شکار کردگی میں ہو وہ دوسرے قیدی شخص کو کب خلاصی دے سکتا ہے۔

جز مگر نادر یکے فردانۓ
تن بزنداں روح او کیوانۓ

مگر وہ نادر اور مقبول بندہ جس کا تن تو اس چاہِ دنیا میں چلتا پھرتا ہو لیکن اس کی روح کیوانی ہو یعنی حق تعالیٰ کے تعلق خاص کی برکت سے اس بندۂ مقبول کی روح مرتبۂ روح میں اس چاہِ دنیا سے رُخ پھیرے ہوئے ہر وقت عالمِ آخرت کی طرف پرواز رکھتی ہو۔

روحانی ارتقاء اور اس کا درجۂ کمال

روح کی تربیت اور اس کا درجۂ کمال یہی ہے کہ اس کی ہر نقل و حرکت مرضیِ الٰہی کے مطابق ہونے لگے اور حق تعالیٰ ہی کی یاد سے اس کو چین اور انس

ہواور نفس کے تمام برے تقاضوں پراس طرح سے غالب اور حاکم ہو جاوے کہ کسی وقت خشم اور شہوت کا غلبہ اس کو استقامت سے نہ ہٹا سکے اور حق تعالیٰ کے ساتھ ایسا قوی رابطہ قائم ہو جائے کہ دنیا کی کوئی طاقت خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی اس کو توحید کے خلاف قولاً یا عملاً اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے، گردن پر خواہ شمشیر ہندی ہو یا قدموں پر سونے چاندی کا ڈھیر ہو مگر وہ خوف اور حرص سے مافوق ہو کر کلمۂ حق پر جبلِ استقامت ہو، اپنے نفس کو معاصی سے پرہیز کا اور طاعات کا اس قدر خوگر بنائے کہ دین پر عمل اس کی طبیعتِ ثانیہ بن جائے حتیٰ کہ جب دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آجائے تو یہ تربیت یافتہ تین خطابات (۱) نفسِ مطمئنہ (۲) نفسِ راضیہ (۳) نفسِ مرضیہ کے القاب سے مشرف ہو کر فوزِ عظیم کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف واپس ہو جائے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُo ارْجِعِیٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةًo﴾

(سورۃ الفجر، ۲۸-۲۷)

ترجمہ: اے اطمینان والی روح! تو اپنے پروردگار کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اپنے پروردگار سے خوش ہے اور تیرا پروردگار تجھ سے خوش ہے پھر تو میرے بندوں میں یعنی نیکوکار بندوں کی جماعت میں داخل ہو جا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے روحانی ارتقاء اور روحانیت کے درجۂ کمال سے بندوں کو مطلع فرمایا ہے تاکہ بندے غلط فہمی سے مادی ترقیات کو روحانی ترقی نہ سمجھ بیٹھیں۔ اللہ تعالیٰ نے نفسِ مطمئنہ فرما کر روح کے درجۂ کمال کا پتہ بتا دیا یعنی روح کا کمال یہی ہے کہ دنیا میں اس کو اپنے پروردگار کی یاد سے چین نصیب ہو گیا ہو۔ روح کا دوسرا کمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات پر عمل کرتے کرتے خود اللہ کی مرضیہ بن جائے یعنی پسندیدہ بن جائے اور جس روح سے اللہ راضی ہو جاتے ہیں تو

اس روح کو اپنی ذات پاک سے بھی راضی فرما دیتے ہیں۔ اس آیت میں خطاب راضیہ کو خطاب مرضیہ سے مقدم فرما کر یہ بتا دیا کہ اے روح! دنیا کی زندگی میں چونکہ تجھے صرف میری ہی ذات سے چین ملتا تھا اور ہر سانس کو میری مرضیات میں صرف کیا تھا، اور اب تیرے چل چلاؤ کا وقت ہے اس لیے اب میں تیری رضا کو مقدم کرتا ہوں یعنی اب تیری تمام خواہشات پوری کی جائیں گی، تیری خواہشات چاہے تھک جائیں لیکن میری عطا دینے سے نہ تھکے گی۔ فِيهَا مَا تَشْتَهِيْ اَنْفُسُكُمْ فرمایا ہے اور دوسری جگہ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ فرمایا ہے وہاں اپنی رضا کو مقدم فرمایا ہے۔ قرآنِ پاک کی عجیب بلاغت ہے کہ راضیہ کی تقدیم سے روح کا کس درجہ بلند مقام ظاہر ہو رہا ہے کہ انتقال کا وقت ہے، اولاد و بیوی، خویش و اقارب سے جدائی ہو رہی ہے مگر اس روح کو اپنے اللہ سے ملنے کی کس درجہ خوشی ہے کہ اس کو حق تعالیٰ نے مقدم بیان فرمایا۔ اس میں ایک لطیف اشارہ یہ بھی ہے کہ یہ روح اپنے اعمالِ حسنہ کی برکت سے مرضیہ تو پہلے ہی سے تھی لیکن اب چونکہ عالم بدل رہا ہے اور دنیا میں اس نے اپنی خواہشات کو میری مرضیات میں جلا بھنا دیا تھا۔ اس لیے اب اس مجاہدہ کا پھل عالمِ آخرت میں اس کو یہ دیا جائے گا کہ اب اس کی ہر رضا ہر خواہش کو میں پوری کروں گا۔ اس خوشخبری کو اسی راضیہ کی تقدیم میں میاں نے بیان فرما دیا ہے۔

اللہ والوں کی روح کس نعمت سے مطمئن ہوتی ہے؟

اس روح کو حق تعالیٰ نے اطمینان والی روح کیوں فرمایا ہے اور روح کو اطمینان کس نعمت کے حاصل ہو جانے سے تھا کیا اس کو دنیا میں مال و دولت اور سلطنت سے اطمینان تھا؟ اس اطمینان کے سبب کو حق تعالیٰ نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے:

﴿اَلاَ بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾

(سورۃ الرعد، آیت:۲۸)

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ خوب غور سے کان کھول کر سن لو کہ دلوں کو چین صرف ہماری یاد سے نصیب ہوتا ہے۔ دنیا میں اس کا مشاہدہ ہے کہ سلاطین کو افکارِ سلطنت کے ہجوم سے نیند نہیں آتی۔ بڑے بڑے اہلِ دولت پریشان ہو رہے ہیں جس کا سبب خدا سے غفلت ہے۔ اور ایک بوریہ نشین اللہ والا حق تعالیٰ کی یاد سے چین میں رہتا ہے۔ اسی کو ہمارے خواجہ صاحب فرماتے ہیں ؎

ہم ان کی یاد میں بیٹھے جو سب سے بے غرض ہو کر
تو اپنا بوریا بھی پھر ہمیں تخت سلیماں تھا

اور فرماتے ہیں ؎

اب تو میں ہوں اور شغلِ یادِ دوست
سارے جھگڑوں سے فراغت ہوگئی

سلطنت اور مال و دولت فی نفسہٖ پریشانی کے اسباب نہیں ہیں بلکہ حق تعالیٰ سے غفلت اصل سبب ہے پریشانی کا اور چونکہ اکثر اہلِ دولت عیش و راحت کے سبب حق تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جاتے ہیں اس لیے ان کے دلوں کو چین اور سکون نہیں ملتا۔ اگر حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اپنے اعمال اور افعال کو رکھیں تو تمام اہلِ سلطنت اور اہلِ دولت بھی ولی بن جائیں۔ کیا حضرات صحابہ مالدار نہ تھے؟ کیا ان میں بڑے بڑے تاجر نہ تھے؟ کیا انہوں نے سلطنتیں نہیں کیں؟ لیکن کیا ان کی ولایت اور بزرگی میں کسی کو شبہ ہوسکتا ہے؟ تو معلوم ہوا کہ اصل چیز اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے، اس کے ساتھ ایک غریب بھی ولی ہوسکتا ہے اور ایک امیر بھی ولی ہوسکتا ہے۔ ولی بننے کے لیے تو حق تعالیٰ نے صرف ایمان اور تقویٰ کی شرط بیان فرمائی ہے، غریب ہونا یا مفلس ہونا شرط

نہیں۔ جاہل فقیروں نے لوگوں کو بڑی غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ بیچارے امراء اور رؤساء کو سمجھا دیا ہے کہ جب تک دنیا کو لات نہ مارو گے فقیری نہیں مل سکتی۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ اس غلط فہمی کا انجام یہ ہوا کہ نہ امراء کو ترکِ دنیا کی ہمت ہوتی ہے نہ وہ دین کو اختیار کرتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ﴾

(سننُ الترمذی، کتابُ البیوع، باب ما جآء فی التجارۃ)

سچا اور امانت دار تاجر قیامت کے دن نبیوں اور صدیقین اور شہیدوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ تاجروں کے لیے کس قدر فضیلت اس حدیث کے اندر وارد ہے۔ سچا اور محقق اللہ والا دنیا کو دین کا تابع بنا کر اس کو بھی دین بنا دیتا ہے۔ حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

چیست دنیا از خدا غافل بُدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

ترجمہ: دنیا نام ہے خدا سے غافل ہو جانے کا۔ سونے چاندی اولاد بیوی کا نام دنیا نہیں ہے۔

تربیتِ ارواح کی تفصیلی کیفیت

ہر نبی کے اپنے زمانے میں ارواح کی تربیت حسب ذیل طریقوں سے ہوئی ہے:

(**الف**) **نزول برکت**: جس طرح سے بارش سے زمین کے اندر زراعت کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے ساتھ حق تعالیٰ کی طرف سے برکت اور رحمتِ خاصہ کا نزول ہوتا ہے جس سے قلوب میں ہدایت قبول کرنے کی یک گونہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔

(ب) فیضانِ صحبت: خدا کا پیغمبر اپنی صحبت کے فیض سے قلوب کی کایا پلٹ دیتا ہے چنانچہ بہت سے لوگ خدا کے پیغمبر کو صرف دیکھ کر یا دو ایک مجلسوں میں شریک ہوکر ایمان کو قبول کر لیتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جس طرح ایک ضعیف البصر شخص کے سامنے تیز روشنی رکھ دینے سے اس کو بھی نظر آنے لگتا ہے اسی طرح دل کی بینائی کا ضعف جو حق اور باطل میں امتیاز کرنے سے مانع تھا انوارِ نبوت کی اعانت سے حق کی حقانیت اور باطل کے بطلان کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔

(ج) دعا اور ھمت: انبیاء علیہم السلام کو امت کی اصلاح کی فکر ہر روز بے چین رکھتی ہے اور شب و روز اپنی دعا اور توجہ سے قلوب امت میں استعداد و ہدایت کا فیض پہنچاتے رہتے ہیں۔ حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ قاز ایک پرندہ ہے جو انڈے دے کر کوسوں دور اُڑ جاتا ہے اور توجہ سے انڈوں کو حرارت پہنچاتا ہے جس کی قوت سے بچے پیدا ہو جاتے ہیں، جب ایک جانور کی توجہ میں حق تعالیٰ نے ایسا اثر رکھا ہے تو ؎

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند
صاف گر باشد ندانم چوں کند

انبیاء علیہم السلام اور اہل اللہ کی توجہ میں کیسا اثر ہوگا؟ اسی کو حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں ؎

اولیاء را در دروں ہا نغمہ ہاست
طالباں را زاں حیات بے بہاست

ترجمہ: اللہ والوں کے باطن میں اللہ کی محبت کے نغمے موجزن ہوتے ہیں یہ نغمات دردِ عشقِ حقیقی کے طالب کے لیے آبِ حیات کا کام دیتے ہیں ؎

گرچہ تفسیر زباں روشن گر است
لیک عشق بے زباں روشن تر است

ترجمہ: زبان سے محبت کی تفسیر اگرچہ روشن ہے لیکن عشقِ کامل اپنے ظہور میں محتاجِ زباں نہیں۔ صاحبِ قصیدہ فرماتے ہیں ۔

یَحْسَبُ الصَّبُّ اَنَّ الْحُبَّ مُنْکَتِمٌ
مَا بَیْنَ مُنْسَجِمٍ مِنْہُ وَ مُضْطَرِمٍ

ترجمہ: کیا عاشق یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا عشق مخفی رہ سکے گا درآنحالیکہ اس کی آنکھیں اشک بار اور اس کا قلبِ مشتعل اس کے عشق پر گواہ ہیں (اور دو گواہوں سے بات ثابت ہوجاتی ہے) کبھی زبان ساکت ہوتی ہے اور اس کا حال ناطق ہوتا ہے ۔

ترے جلووں کے آگے ہمت شرح و بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہ رکھ دی نگاہِ بے زباں رکھ دی

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ میاں اشرف علی صاحب! میں لوگوں سے باتیں کرتا ہوں تو اس وقت بھی آپ میرے قلب کی طرف متوجہ رہا کیجیے کیونکہ میرا قلب اس وقت بھی حق تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہوتا ہے۔ جب امتی کا سکوت ہادی ہوتا ہے تو نبی کا سکوت کیونکر ہادی نہ ہوگا ۔

خامش اند و نعرۂ تکرارِ شاں
می رود تا یار و تختِ یارِ شاں

ترجمہ: اللہ والے خاموش بیٹھے ہوئے ہیں لیکن ان کے باطنی درد اور محبت کے نعروں کا تکرار محبوب حقیقی تک پہنچتا رہتا ہے۔ چونکہ اللہ والوں کے قلوب اللہ کی محبت سے معمور ہوتے ہیں اس لیے ان کے پاس بیٹھنے والوں کے دلوں میں ان کی محبت کے فیض سے حق تعالیٰ کی محبت پیدا ہوجاتی ہے کیونکہ ایک قلب سے دوسرے قلب تک مخفی راستے ہیں کما قال العارف الرومی رحمۂ اللہ ۔

کہ زدل تادل یقیں روزن بود
نے جدا و دورچوں دوتن بود
متصل نہ بود سفالِ دو چراغ
نورشاں ممزوج باشد در مساغ

ترجمہ: حضرت عارف رومی فرماتے ہیں کہ ایک قلب سے دوسرے قلب تک یقیناً مخفی راستے ہیں مثل اجسام کے قلوب آپس میں جدانہیں ہیں۔ پھر مولانا ایک مثال سے اس کی وضاحت فرماتے ہیں کہ دو چراغ روشن کے اجسام الگ الگ ہوتے ہیں مگر فضا میں ان کی روشنی آپس میں ملی ہوئی ہوتی ہے۔ ہمارے خواجہ صاحب فرماتے ہیں جس طرح آگ ایک گھر سے دوسرے گھر کو لگ جاتی ہے اسی طرح عشق ایک سینے سے دوسرے سینے میں منتقل ہوتا ہے ؎

جو آگ کی خاصیت وہ عشق کی خاصیت
اک خانہ بخانہ ہے اک سینہ بہ سینہ ہے

اللہ والوں کی مختصر گفتگو دلوں کو متاثر کیوں کردیتی ہے اور اہلِ ظاہر کی لمبی چوڑی تقریریں قلوب پر اثر انداز کیوں نہیں ہوتیں اس راز کو ہمارے خواجہ صاحب مرحوم نے ایک شعر میں بیان کردیا ہے ؎

دل میں لگا کے ان کی لَو کردے جہاں میں نشر ضو
شمعیں تو جل رہی ہیں سو بزم میں روشنی نہیں

اللہ والا پہلے اپنے دل میں عشق حقیقی کی لو کو روشن کرتا ہے پھر سارے جہان کو اپنے عشق کے انوار سے روشن کردیتا ہے اور جو لوگ کہ بمصداق ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند ایں کارِ دیگر می کنند

ہوتے ہیں وہ اگرچہ تعداد میں سینکڑوں ہوں لیکن بزم میں روشنی نہیں ہوتی یعنی

قلوب ان سے ہدایت یافتہ نہیں ہوتے۔ حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ ارشادفرماتے ہیں۔

عام می خوانند ہر دم نام پاک
ایں اثر نکند چوں نبود عشقناک

ترجمہ: اہلِ ظاہر ہر وقت نامِ پاک کی رٹ لگاتے ہیں، مگر چونکہ ان کا یہ ذکر عشق سے بھرا نہیں ہوتا اس لیے اس کا اثر نہ تو خود ان پر ہوتا ہے اور نہ دوسروں پر۔ دین ہمیشہ صاحبِ نسبت عالم سے پھیلتا ہے اور پھر یہ نسبت جس کی جس قدر قوی ہوتی ہے اسی قدر اس کے انوار قوت سے پھیلتے ہیں۔

(**د**) **خرقِ عادت**: اُمت کی ہدایت کے لیے انبیاء علیہم السلام کو معجزات دیئے جاتے ہیں، معجزہ کے معنیٰ ہیں عاجز کردینے والی چیز۔ معجزہ کا مقصد اثباتِ رسالت ہوتا ہے، یعنی جب تمام مخلوق اس معجزہ کے مثل لانے سے عاجز ہوجائے تو وہ رسولِ خدا کی صداقت اور حجت پر برھان بن جائے۔ نائبینِ رسول سے بھی خرقِ عادت کا ظہور ہوتا ہے اور اس کا نام اصطلاحِ شرع میں کرامت ہے۔ کَرَامَاتُ الْاَوْلِیَآءِ حَقٌّ عقائد کا مسلمہ مسئلہ ہے۔

(**ر**) **نزولِ وحی**: خدا کی طرف سے جو کچھ پیغام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر بذریعۂ جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام نازل فرمایا جاتا ہے، اس کا نام وحیِ الٰہی ہے۔ خدا کا پیغمبر وحی کے ذریعے امت کی ہدایت اور تربیت کا کام انجام دیتا ہے اور اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

سیدنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ تربیت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی تربیت اور ان کا تزکیہ کس طرح فرمایا اس اندازِ تربیت کی ایک عجیب الہامی

تفصیل حق تعالیٰ نے وارد فرمائی ہے اور یہ مضمون سب قرآن ہی سے بیان کروں گا۔

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے مسلمانوں پر بڑا احسان فرمایا ہے جبکہ ان میں ان ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کے دلوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں اور ان کو کتاب اور فہم کی باتیں بتاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ صریح غلطی میں تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ تلاوت

یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پہلے قرآن پاک کی تلاوت فرماتے ہیں۔ تزکیۂ نفوس کے سلسلے میں تلاوت وحی کو مقدم فرمایا ہے۔ اس میں عجیب راز ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات پاک نور، کلام پاک نور، تلاوت فرمانے والا نور، اللہ اکبر جب اتنے انوار جمع ہو جائیں تو پھر دلوں میں اجالا کیونکر نہ پیدا ہوتا۔ ممکنات اور مخلوقات میں ایک ادنیٰ دیا سلائی کو بطور مثال کے لے لیجیے، اگر کسی اندھیرے کمرے میں ایک دیا سلائی جلادیں تو فوراً تاریکی دور ہو جاتی ہے اور تمام کمرہ روشن ہو جاتا ہے۔ روشنی کے ہوتے ہوئے ظلمت باقی نہیں رہ سکتی کیونکہ نور ظلمت میں نافذ ہو جاتا ہے اور ظلمت نور میں نافذ نہیں ہو سکتی۔ جب مادّیات میں حق تعالیٰ نے یہ اثر پیدا فرمایا ہے تو میاں کے انوار میں کیا اثر ہوگا۔

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند
صاف گر باشد ندانم چوں کند

تلاوت کے اندر انوارِ الٰہیہ، انوارِ کلامِ الٰہیہ، انوارِ رسالت موجود تھے جس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ حضرات صحابہ کے سینوں میں اجالا ہوگیا۔ انوار تلاوت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مبارک میں تزکیہ اور تعلیم کتاب اور حکمت کا جو سمندر موجزن تھا اس کی لہریں اس تلاوت میں اپنا کرشمہ دکھا رہی تھیں جس طرح آفتاب نکلنے سے پہلے اس کے انوار مطلع افق پر پہلے ہی سے اپنی آمد کے آثار ظاہر کرنے لگتے ہیں اسی طرح تزکیہ اور تعلیم کتاب وحکمت کا جو آفتاب تلاوت کے بعد طلوع ہونے والا تھا اس کے انوار پہلے ہی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کے اندر اپنی تابانی دکھا رہے تھے جس کا اثر حضرات صحابہ پر یہ ہوا کہ ان کے سینوں میں اتنے انوار تلاوت کے ذریعہ پہنچ گئے کہ ان پر کفر اور شرک کی تاریکی اور گندگی بالکلیہ منکشف ہوگئی کیونکہ ہر شئے اپنی ضد سے متعارف ہوجاتی ہے۔ ظلمت کا ادراک نور کے تقابل سے ہوتا ہے۔ جب مریض کو اپنے امراض کا پتہ چل جاتا ہے تو اس کو علاج کی فکر لگ جاتی ہے۔ چنانچہ حضرات صحابہ کو بعد انکشاف ظلماتِ کفر وشرک کے اپنے علاج کی فکر دامن گیر ہوگئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت اسی فکر اور طلب کی منتظر تھی اور تلاوت میں اسی فکر اور طلب کے پیدا کرنے کی طرف پوری توجہ فرمائی تھی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے دِلوں میں اس حالتِ منتظرہ کو اپنی فراست وبصیرت سے محسوس فرمالیا تو آپ کی رحمت یُزَکِّیھِمْ میں مشغول ہوگئی۔ فکر اور طلب کا انتظار کیوں تھا؟ اس لیے تھا کہ ٹھنڈے پانی کی قدر اور اس کا نفع پیاس کے بعد ہی ہوتا ہے۔ اسی کو حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست
تابجوشد آبت از بالا وپست
تشنگاں گر آب جویند از جہاں
آب ہم جوید بعالم تشنگاں

مولانا فرماتے ہیں کہ پانی کم ڈھونڈو، پہلے پیاس اپنے اندر پیدا کرو تا کہ پیاس کی حالت میں جو پانی بدن میں داخل ہو اس کی شادابی تمہارے ظاہر و باطن سے جوش مارے۔ پیاسے اگر جہان میں پانی ڈھونڈتے ہیں تو پانی بھی عالم میں پیاسوں کو ڈھونڈتا ہے۔

ہر کجا دردے دوا آنجا رود
ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

جہاں درد ہوتا ہے وہیں دوا پہنچتی ہے، جہاں مرض ہوتا ہے وہیں شفا پہنچتی ہے۔ یہ تلاوت اور تزکیہ کا ربط ہے جو حق تعالیٰ نے میرے دل میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے صدقہ میں وارد فرمایا ہے۔ زبان میری ہے اور دل ان کا ہے۔ قرآنِ پاک کے حروف میں اللہ تعالیٰ نے اثر رکھا ہے۔ حروف کے انوار الگ ہیں اور معنیٰ کے انوار الگ ہیں۔ قرآن کا نور غیر مخلوق ہے اور ترجمہ مخلوق ہے۔ جو نسبت حادث اور قدیم، ممکن اور واجب میں ہے وہی نسبت نظمِ قرآن اور اس کے ترجمہ میں ہے۔ وہ جاہل اور پیٹ بھر کے جاہل ہیں جو کہتے ہیں قرآن کی تلاوت بدون ترجمہ سمجھے ہوئے بیکار ہے۔ دونوں جہان میں قرآن سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے، کیونکہ تمام نعمتیں مخلوق ہیں صرف قرآن وہ نعمت ہے جو غیر مخلوق ہے۔ حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؎

نور خورشیدم فتادہ برشما
لیک از خورشید ناگشتہ جدا

مولانا نے قرآنِ مجید کے غیرِ مخلوق ہونے کو ایک عجیب مثال سے واضح فرمایا ہے۔ قرآن کی طرف سے شعر مذکور میں حکایۃً ارشاد ہے کہ میں نورِ خورشید ہوں اور نورِ خورشید کی طرح تم لوگوں پر تاباں اور روشن ہوں لیکن خورشید سے جدا بھی نہیں ہوں یعنی نہ تو خالق ہوں اور نہ خالق کی ذات سے جدا ہوں تو پھر کیا ہوں؟

خالق کا نور ہوں۔ قرآن سے جس قدر قرب نصیب ہوتا ہے اتنا کسی عبادت سے قرب نصیب نہیں ہوتا۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ منتہی کے لیے صرف تلاوتِ قرآن ہی کا معمول رہ جاتا ہے یعنی اوراذکار واوراد بہت تھوڑے رہ جاتے ہیں، تلاوتِ قرآن سے تو دنیا میں قرب نصیب ہوتا ہی ہے لیکن جنت میں بھی قرآن کی تلاوت سے مراتبِ قرب طے ہوں گے۔ جنت میں اور کسی عمل سے ترقی نہ ہوگی کیونکہ وہ دارالعمل نہیں ہے لیکن جنہوں نے یہاں جس قدر قرآن یاد کرلیا ہے جنت میں حکم ہوگا اِقْرَأْ وَارْتَقِ قرآن پڑھتے جاؤ اور چڑھتے جاؤ یعنی تلاوت کرتے جاؤ اور مدارجِ رفیعہ پر ترقی کرتے چلے جاؤ، جس کو جتنا یاد ہوگا سی قدر وہ پڑھتا ہوا درجاتِ قرب کو طے کرلے گا۔ اس دن حفظِ قرآن کی قدر معلوم ہوگی۔ یہ قرآن کا عجیب اعجاز ہے کہ دنیا میں بھی قرب کا ذریعہ تھا اور جنت میں بھی قرب کا ذریعہ ہوگا اور کسی معجزہ کو یہ شرف حاصل نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے قرآن کی تلاوت کا اثر حضرات صحابہ رضوانُ اللہ علیہم اجمعین کے قلوب میں ایسا پیوست ہوگیا کہ خود حضرات صحابہ رضوانُ اللہ علیہم اجمعین کی تلاوت سے وہی فیضِ تلاوت ظاہر ہونے لگا حتیٰ کہ کفارِ قریش نے حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے کہا کہ آپ کی تلاوت سے ہمیں اندیشہ ہے کہ ہمارے بیوی بچے مسلمان ہوجائیں گے لہٰذا آپ بلند آواز سے تلاوت نہ کیا کیجیے۔ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا آپ نے فتنہ کے خوف سے عہد کرلیا لیکن جب حق تعالیٰ کی محبت کا جوش ہوا تو آپ سے ضبط نہ ہوسکا اور محبت نے باآواز بلند تلاوت فرمانے پر مجبور کردیا۔

کہاں تک ضبط بیتابی کہاں تک پاسِ بدنامی
کلیجہ تھام لو یارو کہ ہم فریاد کرتے ہیں
تاب زنجیر ندارد دل دیوانۂ ما

چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم افضل الخلائق اور سید الرسل ہیں اس لیے آپ کے لیے افضل المعجزات معجزہ پہلے ہی سے منتخب فرمالیا گیا تھا اور آپ کے لیے امت بھی وہ منتخب فرمائی گئی جو تمام امتوں کی سردار ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اس پر دال ہے۔

لَمَّا دَعَا اللّٰهُ دَاعِيْنَا لِطَاعَتِهٖ
بِاَكْرَمِ الرُّسُلِ كُنَّا اَكْرَمَ الْاُمَمِ

اور اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی سے منتخب فرمالیا تھا۔

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل سے نمود تھی
پسلی پھڑک گئی نظرِ انتخاب کی

قرآن کا ایک نادر اعجاز یہ بھی ہے کہ وہ نظماً اور معناً تحریف سے محفوظ ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾

(سورۃ الحجر، آیت:۹)

جس چیز کی حفاظت خدا نے اپنے ذمے لے لی ہو تو بھلا خدا کے خزانے میں کون چوری کر سکتا ہے۔ تلاوت کے بعد اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تزکیہ سنئے، جن کے سینوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پاک فرمائیں ان کے تزکیہ کا کیا پوچھنا۔ جب اس امت کے ادنیٰ غلاموں کی صحبت سے بڑے بڑے غوث و ابدال و اقطاب پیدا ہوتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ پاک سے کیسے کیسے عالی مرتبت افراد پیدا ہوں گے ظاہر ہے۔ جن کے سینے کفر و شرک کی گندگی سے ملوث تھے، جن کا ہر فرد وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ کا مصداق تھا، جن کے قلوب بالکل اندھے تھے ان کے دلوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضانِ صحبت نے بذریعہ انوارِ تلاوت، انوارِ تزکیہ، انوارِ تعلیمِ کتاب و حکمت

بینا کردیا حتیٰ کہ حضرات صحابہ رضوانُ اللہ علیہم اجمعین کا ہر فرد مبلغ علی منہاج النبوۃ بن گیا۔

تو نے مجھ کو کیا سے کیا شوق فراواں کردیا
پہلے جاں پھر جانِ جاں پھر جانِ جاناں کردیا

قرآنی لطائف

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ﴾

(سورۂ یوسف، آیت: ۱۰۸)

اے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجیے کہ یہ ہمارا راستہ ہے (اس میں اسم اشارہ ھٰذِہٖ اپنے مشارٌ الیہ کا وجود محسوس مبصر چاہتا ہے پس حق تعالیٰ نے ھٰذِہٖ فرما کر یہ بتادیا کہ صراطِ مستقیم ہمارے رسول کی بصیرتِ کاملہ کے سامنے مثل محسوس خارجی کے ہے، کہیں اس میں خفا نہیں ہے) هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ کا ترجمہ بزبانِ محبت میں یہ کرتا ہوں کہ یہ راستہ میرا ایسا راستہ ہے کہ میں اس راستہ پر لوگوں کو لا کر اللہ تک پہنچا دیتا ہوں، میرے راستے کی تفسیر دعوۃ الی اللہ علیٰ وجہ البصیرۃ ہے۔ علیٰ وجہ البصیرۃ کا مفہوم یہ ہے کہ یہ راستہ میرا دیدہ و دانستہ ہے۔

اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ فرما کر یہ بتلادیا کہ دعوۃ الی اللہ کی اصل باگ تو میرے رسول کے ہاتھ میں ہے لیکن میرے رسول کی صحبت پاک میں ایسی کیمیاوی تاثیر ہے کہ اس کی برکت سے ان کے متبعین بھی دعوۃ الی اللہ علی منہاج النبوۃ کی صلاحیت سے مشرف ہوجاتے ہیں۔

چشم احمد بر ابوبکرے زدہ
از یکے تصدیق صدیق آمدہ

حضرت ابوبکر پر احمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی نگاہِ مبارک پڑی کہ ایک تصدیق سے صدیق ہو گئے۔ حضرت مولانا اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت مولانا! صدیق کس کو کہتے ہیں؟ فرمایا کہ آئینۂ نبوت کو۔ سبحان اللہ کیا دو لفظ میں فرما دیا۔ صدیق آئینۂ نبوت ہوتا ہے۔

چوں عمر شیدائے آں معشوق شد
حق و باطل را چوں دل فاروق شد

سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ جاں نثار ہوئے تو فیضِ رسالت سے آپ کو فاروقیت عطا ہوئی اور آپ عمر فاروق ہو گئے رضی اللہ عنہٗ۔

چونکہ عثمان آں جہاں را عین گشت
نور فائض بودو ذی النورین گشت

جب کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس جہان کے سر چشمہ ہو گئے تو آپ نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے ذوالنورین ہو گئے۔

چوں زرویش مرتضٰی شد درخشاں
گشت او شیر خدا در مرج جاں

جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہٗ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک سے درخشاں ہوئے یعنی علومِ نبوت کو پہچاننے والے ہوئے تو آپ جان کی چراگاہ میں شیر خدا ہو گئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات اور فیوض و برکات قیامت تک امت پر ہوتے رہیں گے۔ ہمارے حضرت مرشد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ولایت کی کرسیاں اب بھی خالی نہیں ہیں سب پُر ہیں، اب بھی غوثِ پاک کی کرسی پر بیٹھنے والے لوگ موجود ہیں۔ اس وقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ پر ایک حالت غالب ہوگئی اور فرمایا۔

ہنوزاں ابرِ رحمت درفشاں است
خم و خمخانہ بامہر و نشاں است

حق تعالیٰ نے کفارِعرب سے هٰذِهٖ سَبِيْلِیْ فرما کرحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عجیب شان بیان فرمادی یعنی حق تعالیٰ نے اپنے راستے کو اپنے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت فرما کر یہ بتادیا کہ ۔

ہم تمہارے تم ہمارے ہو چکے
دونوں جانب سے اشارے ہو چکے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار اور مشرکینِ عرب سے فرمارہے ہیں کہ یہ میرا راستہ ہے۔ هٰذِهٖ سَبِيْلِیْ یہ راستہ میرا اس قدر بدیہی ہے کہ ہر وقت تمہارے مشاہدات میں ہے۔ اے کفارِعرب! تم اپنی ایذا رسانیوں کو دیکھو اور میرے صبر کے پہاڑ کو دیکھو۔ تم ہم کو مجنوں سمجھتے ہو تم ہم کو شاعر کہتے ہو، تم ہم کو جادوگر کہتے ہو اور کبھی کاہن کہتے ہو، یہ سب کچھ تو سامنے کہتے ہو اور پس پشت نہ جانے کیا کیا افتراء کرتے ہو گے اور میرا حلم وصبر تم دیکھتے ہو کہ میں تمہاری ان ایذا رسانیوں کے بدلے بجائے انتقام تمہاری ہدایت کے لیے دعائیں کرتا ہوں، اور ہر وقت گھلتا رہتا ہوں حتیٰ کہ میں جن کا رسول ہوں وہ فرمارہے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا ان کی ہدایت کی حرص اور دلسوزی میں آپ اپنی جان ہی کو ہلاک کر ڈالیں گے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ الخ بھلا کسی غیر رسول کو اتنی تکلیفیں دے کر دیکھتے۔ میرے خلقِ عظیم میری صدقِ رسالت پر شہادت دیتے ہیں اور تم شاہد بنو یا نہ بنو لیکن میرا اللہ فرمارہا ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ صاحبِ خلقِ عظیم ہیں۔

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآنی شہادت

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ اور عَلٰى فرما کر یہ بتادیا کہ ہمارے رسول

صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اخلاقِ عظیمہ گویا ایک سواری ہے اور آپ اس کے شہسوار ہیں جس طرف چاہتے ہیں اس کی باگ پھیر دیتے ہیں، کیا مجال کے باگ کھینچ لینے پر کوئی خُلق سرِ مو اپنی جگہ سے ہل سکے۔ اس کا نام استقامتِ کاملہ ہے، ہر خُلق اپنی جگہ پر جبلِ استقامت ہے۔ دنیا میں ایسا صاحبِ خُلقِ عظیم نہ پیدا ہوا نہ پیدا ہوگا، قرآنِ پاک کے ایک ایک حرف میں عجیب بلاغت ہے۔ لفظ علٰی سے کس درجہ کمالِ ملکۂ راسخہ فی الخُلق کا اظہار فرمایا گیا ہے ؎

محدراتِ سرا پردہ ہائے قرآنی
چہ دلبرند کہ دل می برند پنہانی

عَلٰی بَصِیْرَۃٍ فرما کر یہ بتادیا کہ ہم تمہیں اللہ کی طرف جو دعوت دے رہے ہیں تو ہم راستے کو دیکھ بھال کر چلتے ہیں اور ہماری بصیرت اس قدر قوی النور ہے کہ اس نے میرے اصحاب کے قلوب کو بھی منور کردیا ہے اور میری صحبتِ پاک کی اس کیمیاوی تاثیر پر قرآن کی شہادت کافی ہے۔ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ اور یہ ایسی شہادت ہے کہ مجھے اس کے اعلان کا حکم فرمایا گیا ہے۔ قُلْ آپ فرما دیجیے کہ اس دعوۃ الی اللہ علیٰ وجہ البصیرۃ میں اصالۃً میں امام ہوں اور نیابۃً وتبعاً میرے تمام اصحاب بھی شریک ہیں۔ سبحان اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ پاک اور معیتِ پاک نے کیسی کایا پلٹ دی کہ کفر اور شرک کی گندگی میں آلودہ انسانوں میں مقامِ نبوت اور مزاجِ نبوت میں شانِ نیابت پیدا فرمادی۔ ظلمت کا نور بن کر پھر دوسروں کے لیے منور ہو جانا یہ خود اپنی جگہ پر معجزۂ عظیمہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پاک کی اس تاثیر کو دیکھ کر آپ کے اصحاب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی طرف سے بزبانِ حال یہی شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

تو نے مجھ کو کیا سے کیا شوقِ فراواں کردیا
پہلے جاں پھر جانِ جاں پھر جانِ جاناں کردیا

حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

نائبِ حق ہمچوں جانِ عالم است
ہستی او ظلِ اسم اعظم است

حق تعالیٰ کا نائب سارے عالم کی جان ہوتا ہے، اس کی حیات عالم کی حیات اور اس کی ممات عالم کی ممات ہوتی ہے۔ اس کی ہستی اسم اعظم کا پرتو ہوتی ہے ؎

نورِ حقی و بحق جذّاب جاں
خُلق در ظلماتِ وہم و بدگماں

نائبِ حق نورِ حق ہے اور جانوں کو حق کی طرف کھینچنے والا ہے اور مخلوق اوہام کی تاریکی میں بدگمان ہے۔

مجھے تو کچھ نہیں آتا نہ میں پہلے سے کچھ سوچ کر کہتا ہوں یہ سب ہمارے حضرت مرشدی رحمۃ اللہ علیہ کا فیض ہے۔ بڑے میاں نے اس اپنے باولے کے متعلق فرمایا تھا کہ تو حاملِ علومِ ولایت اور حاملِ علومِ نبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے پیر کی زبان کی لاج رکھ لیتے ہیں ؎

تھانہ ہم قونیہؔ ہم تبریز ما
رومی و شمس است مارا تھانوی

تھانہ بھون ہمارے لیے قونیہ اور شہر تبریز ہے اور ہمارے مولائے اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے لیے مولائے روم اور شمس الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ ہیں ؎

ہر زمانے فوح روح انگیز جان
از فراز عرش بر تبریزیان

اے اللہ! ہر لحظہ عرش کی بلندی سے اہلِ تبریز پر خاص رحمت فرماتے رہیے ؎

من ہم از فیضان انفاس جلال
در رسیدم تا جلیلِ ذوالجلال

مجھ کوحضرت جلال الدین رومی کے فیض نے جلیل ذوالجلال تک پہنچادیا ہے۔

چوں بر آرم دم بہ اللہ الصمد
چرخ نعرہ لیتنی کنت زند

جس وقت میں زبانِ عشق سے اللہ کا نام لیتا ہوں اس وقت چرخ نعرہَ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابًا بلند کرتا ہے یعنی میرے عشق سے منفعل ہوجاتا ہے۔

اللہ اللہ ایں چہ احساں کردۂ
در چنیں برزخ چساں در پردۂ

ہمارے پیر بھائی مولانا اظہر علی صاحب نے ڈھاکہ سے مجھے ایک خط لکھا اس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس اور صحبتِ پاک کے تذکرے کے بعد عجیب و غریب اورلذیذ شعر تحریر فرمایا جس کو پڑھ کر بے ساختہ رونا آ گیا۔ وہ شعر یہ ہے۔

یاد آں روزے کہ در مے خانہ منزل داشتم
جام مئے در دست و جاناں در مقابل داشتم

اس وقت اسی مضمون کے مناسب ایک شعر اور یاد پڑا۔

از حال خود آگہ نیم جز ایں قدر دانم کہ تو
چوں بخاطر بگذری اشکم زداماں بگذرد

میں بقسم کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ کے یہ انعامات میرے مجاہدات کے ثمرات نہیں ہیں۔ مجھ سے کچھ مجاہدہ نہیں ہوا، سب کچھ ان کی طرف سے عطاء محض ہے۔ البتہ ایک نعمت قلب میں حق تعالیٰ نے شروع ہی سے بدونِ استحقاق عطا کی تھی۔ وہ اپنی اور اپنے مقبولین کی محبت ہے اور ہر آن بزبانِ ہر بنِ مو یہ درخواست رہتی ہے کہ حق تعالیٰ میری گردن کو اپنی راہ پاک میں قبول فرمالیں۔

عشقِ حقیقی

ولنعم ما قال الحافظ شیرازی رحمہ اللہ۔

آن دم کہ دل بعشق دہی خوش دمے بود
درکار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست
ہمہ آہوانِ صحرا سرِخود نہادہ برکف
بہ امید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

دین من از عشق زندہ بودن است
زندگی زیں جاں وسر ننگ من است

میرا دین حق تعالیٰ کی محبت سے زندہ رہنا ہے اور اس جان وسر سے جینا میرے لیے ننگ ہے۔

عشق می گوید بہ گوشم پست پست
صید بودن بہتر از صیادی است

میرے کان میں آہستہ آہستہ عشق یہ کہہ رہا ہے کہ ان کی راہ میں ان کی محبت کا صید (شکار) رہنا صیادی سے بہتر ہے۔

برسرِ مقطوع اگر صد خندق است
پیش درد او مزاحِ مطلق است

سر بریدۂ عشق کے سامنے اگر چہ سو خندق ہوں لیکن اس کے درد کے سامنے وہ سب محض مزاح ہیں۔

حضرت سرمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

سرمد گلہ اختصار می باید کرد
یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن بہ رضائے دوست می باید داد
یا قطعِ نظر زِیار می باید کرد

اے سرمد! اب گلہ کو مختصر کرنا چاہیے۔ اب تو دو کاموں میں سے ایک کام کو کرہی لینا چاہیے، یا جسم کو رضائے دوست میں قربان کرنا چاہیے یا پھر اس جھوٹی محبت کا دعویٰ ہی ترک کر دینا چاہیے ؎

یا مکن با پیل باناں دوستی
یا بنا کن خانہ بر انداز پیل
یا مکن بر چہرہ نیل عاشقی
یا فروشو جامۂ تقویٰ بہ نیل

میں کیا کہہ رہا تھا اور عشق مجھ کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے ؎

بوئے آں دلبر چو پراں می شود
ایں زبانہا جملہ حیراں می شود

جب محبوب کی خوشبو روح کو پہنچتی ہے تو تمام زبانیں محوِ حیرت ہو جاتی ہیں۔ حق تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اسی کو اپنی محبت عطا فرماتے ہیں ؎

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر چھیڑا نہیں جاتا

قرآن کا اعجاز

کفار اور مشرکینِ عرب اگر غور کرتے تو قرآن کے انوکھے الفاظ سے سمجھ لیتے کہ اس کلام کا تعلق لغت سے نہیں مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ کی جب تلاوت فرمائی تو بصیرۃ کا لفظ ان کی لغت میں موجود نہ تھا، وہ لوگ نہ تو صاحبِ بصیرت تھے نہ بصیرۃ کے مفہوم سے آگاہ تھے۔ اسی طرح تلاوتِ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم میں احسان، اخلاص، ایمان، صلوٰۃ، زکوٰۃ، جیسی صدہا ایسی نئی نئی اور انوکھی اصطلاحات سے سمجھ لینا

چاہیے تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کہاں کی بولی بول رہے ہیں۔

تو ندیدی گہے سلیمان را
چہ شناسی زبانِ مرغانِ را

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتَابُ وَلاَ الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنَاهُ نُوْرًا نَهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾

(سورۃ الشوریٰ، آیت: ۵۲)

ترجمہ: اے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ تو اَن پڑھ تھے، آپ کو کیا خبر تھی کہ کتاب کس کا نام ہے اور ایمان کس کا نام ہے، لیکن ہم نے اس قرآن کو ایک نور بنایا ہے جس کے ذریعہ ہم بندوں میں جس کو چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں۔

سورۂ یونس میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَo فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَo﴾

(سورۂ یونس، آیت: ۱۷-۱۶)

ترجمہ: اے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجیے کہ اگر خدا کو منظور نہ ہوتا تو نہ تو میں تم کو پڑھ کر سناتا اور نہ اللہ تعالیٰ تم کو اس کی اطلاع دیتا کیونکہ اس کے پہلے بھی تو ایک بڑے حصۂ عمر تک تم میں رہ چکا ہوں یعنی چالیس برس تک میری زندگی تم لوگوں میں گذری ہے لیکن نزولِ وحی سے پہلے میری زبان سے تم لوگوں نے ایسی بولی کبھی نہیں سنی تھی، سواس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا، جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے یا اس کی آیتوں کو جھوٹا بتلاوے یقیناً ایسے مجرموں کو اصلاً فلاح نہ ہوگی۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی اس مقام کی یوں تفسیر فرماتے ہیں کہ یعنی اگر میں بناتا ہوں تو مجھ سا ظالم کوئی نہیں اور جو میں سچا ہوں تو جھٹلانے والوں پر یہی بات ہے۔ (موضح القرآن)

یوں تو اللہ تعالیٰ کی سنتِ جاریہ حضرت آدم علیہ السلام سے چلی آرہی تھی کہ پیغمبر کا استاد غیر پیغمبر نہیں ہوا یا تو براہِ راست حق تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ تعلیم فرمائی یا نبی کا استاد نبی کو بنادیا۔ مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے بیٹے بھی ہیں شاگرد بھی، حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے بھی ہیں، شاگرد بھی، حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حقیقی بھائی بھی تھے اور شاگرد بھی تھے۔

اب کوئی شبہ بھی کرسکتا ہے کہ پھر حضرت خضر علیہ السلام کی شاگردی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیوں کی تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کی شاگردی کا حکم نہیں ہوا تھا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی مصلحت کے لیے از خود حضرت خضر علیہ السلام کی مصاحبت کا اپنے اوپر التزام کرلیا تھا، اور درحقیقت اس خاص امر میں اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احتیاط فی الکلام کی تعلیم ہوجاوے کیونکہ انہوں نے بنی اسرائیل میں ایک بار وعظ فرمایا تھا تو کسی نے پوچھا کہ اس وقت سب سے بڑا عالم کون شخص ہے آپ نے فرمایا کہ میں۔ مطلب یہ تھا کہ ان علوم میں کہ جن کو قرب الی اللہ کی تحصیل میں دخل ہے میرے برابر کوئی نہیں لیکن چونکہ ظاہراً لفظ مطلق تھا، اس لیے حق تعالیٰ نے تعلیماً ارشاد فرمایا کہ ہمارا بندہ مجمع البحرین میں تم سے بھی زیادہ علم رکھتا ہے، مطلب یہ تھا کہ بعض علوم میں وہ تم سے بھی زیادہ ہے گو ان علوم کو قرب الٰہی میں دخل نہ ہو۔ پس حضرت خضر علیہ السلام کی فضیلت جزئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کلی کے منافی نہیں۔ یہ

ہمارے حضرت مرشدی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ارشاد فرمودہ تحقیق ہے۔ اسی سنتِ الٰہیہ کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے غیر استاد تو ہو ہی نہیں سکتا تھا لیکن آپ کے شرف سیادت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حق تعالیٰ نے آپ کے لیے کسی پیغمبر کو بھی استاد نہیں بنایا۔ میاں نے براہِ راست اپنی بولی سکھائی ہے۔ پھر میاں کی بولی کا کون مقابلہ کرسکتا ہے ۔

گرچہ قرآں از لب پیغمبر است
ہر کہ گوید حق نگفت او کافر است

ضرورتِ صحبتِ کاملین پر قرآنی استدلال

جس طرح کتاب اللہ کا نزول امت کی ہدایت کے لئے ضروری ہے اسی طرح اس کتاب کی تعلیم اور اس پر عملی مشق کے لئے رسول اللہ کی بعثت بھی ضروری ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے قرآن کی شان میں جہاں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿نَهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا﴾

(سورۃ الشوریٰ، آیت: ۵۲)

یعنی قرآن کے ذریعہ ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت فرماتے ہیں وہیں متصلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بھی ارشاد فرمادی کہ:

﴿وَاِنَّکَ لَتَهْدِىْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

(سورۃ الشوریٰ، آیت: ۵۲)

اور بے شک آپ صراطِ مستقیم کی ہدایت فرماتے ہیں۔ اس کو متصلاً نازل فرما کر یہ بتادیا کہ قرآن کی شانِ ہدایت جو آیتِ بالا میں ارشاد ہوئی ہے اس سے اہلِ عرب کو دھوکا نہ لگ جائے کہ بس جی ہم عربی زبان کے ماہر ہیں قرآن سے ہدایت حاصل کرلیں گے۔ فوراً تنبیہ فرمائی ہے کہ ہمارے رسول سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔

حق تعالیٰ نے فعلِ ہدایت کی نسبت کو اپنی طرف بواسطۂ قرآن فرمایا اور اپنے رسول کی شان میں اس مقام پر کوئی واسطہ نہیں بیان فرمایا لَتَهْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ آپ ہدایت فرماتے ہیں صراط مستقیم کے ساتھ اور تَهْدِیْ پر لام تاکید بھی لگا ہوا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ براہِ راست تربیت اور ہدایت جو حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اس کا تحمل صرف انبیاء علیہم السلام کر سکتے ہیں اور امت کی ہدایت بواسطۂ رسالت ہوتی ہے۔

قرآن کی عجیب شانِ بلاغت ہے آگے صراطِ مستقیم کو صراطُ اللہ ارشاد فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان بتادی کہ میرا رسول جو تمہارے اندر اس وقت موجود ہے یہ میرا معمولی احسان نہیں ہے وہ تمہیں جس راہ پر لانے کے لیے تمہاری تمام بدخلقیوں اور ایذا رسانیوں کو برداشت کر رہے ہیں وہ راستہ میرا راستہ ہے ہمارے رسول تمہیں تمہارے پروردگارِ حقیقی تک پہنچانے کے لئے اپنی جان پر کیسے کیسے غم والم کے پہاڑ کو برداشت کر رہے ہیں۔

میری رحمت کی تو یہ شان ہے کہ میں نے تمہیں جہنم سے بچانے کے لئے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے اندر تمہاری تربیت اور تزکیہ کے لیے وَاصْبِرْ نَفْسَکَ کے امر کے ساتھ مامور فرمایا ہے یعنی میرا رسول تو نوری ہے تم فرشیوں کے اندر ایسی عرشی روح پاک کو جو میں نے بھیجا ہے وہ اسی لئے کہ ان کی صحبت پاک سے تم بن جاؤ۔ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مذاق تو تبتلِ تام کا ہے یعنی خلق سے انقطاع تام کر کے ہماری یاد میں مشغولی ہی ان کی اصل غذا ہے لیکن اس کے باوجود میری رحمت نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے مجاہدہ کرا کے تمہارے اندر مجالست کا حکم فرمایا ہے تا کہ اس پھولِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں تمہیں بسا کر تمہارے ہاتھ میں آئندہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی باگ سپرد کر دیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق مع اللہ اور شرطِ منصب

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ میں جولفظِ صبر ہے اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی رفیع شان ظاہر فرمائی گئی ہے یعنی غلبۂ تعلق مع اللہ کے سبب آپ پر مشغولیِ خلق طبعاً شاق تھی مگر امتثال امرِ الٰہی کے لیے آپ بہ جبرِ نفس حضرات صحابہ رضوانُ اللہ علیہم اجمعین کی تربیت کے لیے مجالست فرماتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابتِ صادقہ حق تعالیٰ اپنے جن مقبول بندوں کو عطا فرماتے ہیں ان کو اسی مذاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے مقامِ تبتل عطا فرماتے ہیں، اور ایسے ہی حضرات منصبِ اصلاح کے اصلی اہل ہوتے ہیں۔

ہمارے حضرت مرشدی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق بھی تبتل کا تھا۔ طبعاً مشغولی مع الخلق حضرت رحمۃ اللہ علیہ پر شاق تھی اور اولیاء اللہ کا یہ تبتل دراصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے تبتل کا پرتو ہوتا ہے۔ اس میں بات یہ ہے کہ جب تک شیخ کے اندر نسبتِ متعدیہ کی شان نہ ہو اس وقت تک وہ دوسروں کے اندر تعلق مع اللہ کی روح نہیں پھونک سکتا، اور نسبت میں پختگی اور تعدیہ کی شان اسی وقت پیدا ہوتی ہے، جب روح کو تبتلِ تام کا مذاق نصیب ہو جائے۔

ہمارے خواجہ صاحب نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں خوب فرمایا ہے ؎

جس قلب کی آہوں نے دل پھونک دیئے لاکھوں
اس قلب میں یا اللہ کیا آگ بھری ہوگی

حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

کے دہد زندانئے در اقتناص
مرد زندانی دیگر را اخلاص

جو خود علائقِ دنیویہ سے انقطاعِ تام اپنی روح میں راسخ نہیں کر سکا وہ دوسروں کو

کب ان علائق سے چھڑا سکتا ہے، جس کی روح خود زندانِ علائق دنیویہ میں محبوس ہے اس کے اندر کب اتنی قوت ہوسکتی ہے کہ وہ دوسرے قیدی کو آزاد کرا سکے۔

خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

ایک سوتا ہوا دوسرے سوتے ہوئے کو کب بیدار کرسکتا ہے۔

جز مگر نادر یکے فردائے
تن بزنداں روح او کیوائے

مولانا فرماتے ہیں کہ مگر وہ نادر اور مقدس ذات لوگوں کی ارواح کو زندان علائق سے آزاد کرا سکتی ہے جس کا جسم تو دنیا میں چلتا پھرتا ضرور نظر آتا ہے لیکن اس کی روحِ پاک نے اس عالمِ ناسوت میں یعنی دنیا میں اپنے اندر کثرتِ فکر اور فیضِ مرشدِ کامل سے تعلق مع اللہ کا ملکۂ راسخہ حاصل کرلیا ہے۔

دائم اندر آب کار ماہی است
مار را با او کجا ہمراہی است

حضرت عارف فرماتے ہیں کہ ہر وقت حق تعالیٰ کے ساتھ انس کا نصیب ہونا اور کسی وقت ذہول نہ ہونا یہ ماہیانِ بحرِ حق کا کام ہے۔ پانی میں ہر وقت رہنا مچھلیوں ہی کا کام ہے، سانپ یعنی اہلِ ھویٰ ونفس کب مچھلی کے ساتھ یعنی اہل اللہ کے ساتھ چل سکتے ہیں۔

جب دعوۃ الی اللہ کے لئے خلق کے ساتھ متکلم ہوتا ہے تو اس کے کلام میں استحضار عظمت حق اور استحضار معیت حق کے انوار ہوتے ہیں، جو دوسروں پر بدون اثر کئے نہیں رہتے۔

شیخ نورانی ز رہ آگہہ کند
نور را بالفظہا ہمرہ کند

مولانا فرماتے ہیں کہ وہ نورانی شیخ لوگوں کو راستہ سے آگاہ کرتا ہے اور اپنے انوارِنسبت کو اپنے الفاظ کے ہمراہ سامعین کے دلوں میں پہنچا دیتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور شانِ تلاوت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت الی اللہ میں تلاوت کی جو شان تھی اس میں منجملہ انوارِ ذاتِ حق اور انوارِ کلامِ حق اور انوارِ رسالت اور انوارِ شانِ تزکیہ اور انوارِ تعلیمِ کتاب وحکمت کی ایک خاص کیفیت بھی شامل ہوتی تھی، وہ یہ کہ آپ کو تلاوت کے وقت حق تعالیٰ کی عظمت اور حق تعالیٰ کی معیتِ خاصہ کا استحضار رہتا تھا کہ میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے اور میں اپنے اللہ کے سامنے منصبِ رسالت کو انجام دے رہا ہوں، یہ استحضار آپ پر ایک خاص احسانی کیفیت طاری کر دیتا تھا گو تلاوت کے وقت ابھی تعلیمِ کتاب اور تعلیمِ حکمت شروع نہیں ہے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت آیات کے معانی اور استحضار کے ساتھ ہوتی تھی جس کا اثر یہ تھا کہ سامعین کے قلوب سینوں سے نکلے جاتے تھے اور ہر شخص بزبانِ حال یہ شعر پڑھتا تھا۔

دل چھین لیا ایک جوانِ عربی نے
مکی مدنی ہاشمی و مُطّلبی نے

دنیا کی ایک مثال ہے جس سے مقصود ایک بات سمجھانی ہے ورنہ اس مثال کو ممثل لہٗ سے ادنیٰ درجہ کا بھی تعلق نہیں، وہ مثال یہ ہے کہ ایک شاعر جب کسی مشاعرہ میں اپنا کلام سناتا ہے تو کلام کے مناسب اپنے اوپر ویسا ہی حال طاری کر لیتا ہے اور اسی حال کے سبب اس کا کلام سامعین کو متاثر کرتا ہے لیکن یہاں تو حال طاری کیا جاتا ہے فی نفسہٖ مجاز میں کچھ دم نہیں۔

عشقِ مجازی کا بودہ پن

حضرت عارف رومی فرماتے ہیں ؂

چوں رود نورو شود پیدا دخان
بفسرد عشق مجازی آں زمان

جب وہ عارضی اور مستعار روشنی فانی محبوب کے چہرے سے زائل ہوجاتی ہے اور دھواں ظاہر ہوجاتا ہے تو عشقِ مجازی اس وقت مضمحل اور سرد پڑ جاتا ہے اور عشقِ حقیقی کی شان یہ ہوتی ہے کہ ہمیشہ اس کا کاروبار گرم اور ترقی پذیر رہتا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں ؂

زیں سبب ہنگامہا شد کل ہدر
باشد ایں ہنگامہ ہردم گرم تر

ترجمہ: اسی واسطے عشقِ مجازی کے سارے ہنگامے کچھ دنوں کے بعد افسردہ اور ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں اور عشقِ حقیقی کا ہنگامہ ہردم گرم تر رہتا ہے ؂

دل کا ہو مطلوب کوئی غیرِ حق
ہے یہ مستیٔ شرابِ قہرِ حق
گھور پر جیسے ہو کوئی سبزہ زار
چشم دھوکا کھا کے ہو اس کا شکار
ہو گئے کتنے ہلاک اس راہ میں
کھو کے منزل گر گئے وہ چاہ میں

پس شاعر حال کو طاری کرتا ہے اور عارف پر خود حال طاری ہوجاتا ہے کیونکہ شاعر کے معانی صرف ذہنی تصورات اور تخیلات ہوتے ہیں اور عارف کے قلب پر حق تعالیٰ کی عظمت اور محبت کے جو علوم القاء ہوتے ہیں وہ تصدیقات ہوتے ہیں ۔

چراغِ مردہ کجا شمع آفتاب کجا

چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت میں حضور کی کیفیاتِ قلبیہ بھی شامل رہتی تھیں اس لئے مخاطبین آپ کی تلاوت ہی سے تڑپ جاتے تھے ۔

جس قلب کی آہوں نے دل پھونک دیئے لاکھوں
اس قلب میں یا اللہ کیا آگ بھری ہوگی

اہلِ عرب کا تحیر

اہلِ عرب حیران تھے فاعلات فاعلات فاعلات مستفعلن مستفعلن مستفعلن وغیرہ کے جتنے بحور تھے ان میں سے کسی ایک بحر میں قرآن نہیں یہ انوکھی بحر ہے جو مادّیات اور محسوسات سے پرے کی خبر دیتی ہے اور لوگوں کے سینوں میں جو امراضِ روحانیہ پنہاں تھے ان کو آنکھوں کے سامنے کردیتی ہے، اہلِ سائنس آلات کے ذریعہ بخار اور دق کا مشاہدہ کرسکتے ہیں۔ لیکن کسی آلے کے ذریعہ دل کے باطنی امراض مثلاً بغض، حسد، کینہ، تکبر، خود بینی وغیرہ کے مادّوں کو نہیں دکھا سکتے۔ کفار اور مشرکینِ عرب کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلاوت کے انوار سے ان کے سینوں کے مخفی امراض کا مشاہدہ کرادیا۔ دنیا میں جب کسی مہلک مرض کا ایکسرے وغیرہ سے پتہ چل جاتا ہے تو مریض قرض لے کر بیوی کا زیور بیچ کر علاج کی فکر میں لگ جاتا ہے، بس یہی حال بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑھ کر جب حضراتِ صحابہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ پاک میں اپنے امراض کا پتہ چل گیا تو علاج کے لیے بے چین ہوگئے۔ حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ ایک نابینا صحابی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پاک میں ان کی حاضری کی حق تعالیٰ نے عجیب شان بیان فرمائی ہے۔ وَاَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی وَھُوَ یَخْشٰی حق تعالیٰ بیان فرماتے ہیں کہ اور جو

شخص آپ کے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے۔اس سعی اور خشیت کے اندر حق تعالیٰ نے علم عظیم رکھ دیا وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت عبداللہ ابن مکتوم رضی اللہ عنہٗ کا دوڑتے ہوئے آنا ہماری محبت کے سبب سے ہے۔ مَحَبَّتُکَ جَآءَ تْ بِیْ اِلَیْکَ آپ کی محبت آپ کے پاس مجھے کھینچ لائی۔

میرا ایک واقعہ

اس مقام پر مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آیا۔ایک بار حضرت شاہ عبدالرزاق صاحب بانسوی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری کے ارادہ میں جارہا تھا۔ جب تین چار میل باقی رہ گئے تو میں غلبۂ محبت کے سبب تاب نہ لاسکا اور بے اختیار دوڑنے لگا۔

تاب زنجیرِ ندارد دل دیوانۂ ما
یاد یاراں یار را میموں بود
خاصہ کاں لیلیٰ و ہم مجنوں بود

جس وقت میں مزار پر حاضر ہوا ہوں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے سر پر گویا نسبت کا پہاڑ رکھ دیا گیا۔دو ماہ تک اس درجہ غلبۂ استحضارِ حق تھا کہ میں آسمان کی طرف غلبۂ ادب کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتا تھا، بڑے صاحب فیضِ بزرگ ہیں۔

حضرت شاہ عبدالرزاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ صرف پارۂ عم تک پڑھے تھے، لیکن بہت بڑے آدمی تھے ان کی نسبت اس قدر اونچی تھی کہ بدون وارد کے کلام نہیں فرماتے تھے۔ کھبر دیت یعنی حق تعالیٰ خبر دے رہے ہیں۔اس کے بعد کلام فرماتے تھے۔ حضرت ملا نظام الدین فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ جو درسِ نظامیہ کے بانی ہیں اور فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب کے وقت تقریباً پانچ سو علماء کے افسر تھے وہ انہی بزرگ شاہ عبدالرزاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے۔

ایک آیت کے متعلق تفسیری لطائف

حق تعالیٰ نے اس آیت میں یَسْعٰی کو یَخْشٰی سے مقدم فرمایا ہے یعنی اصل حالت غلبۂ محبت ہی کی مطلوب ہے۔ محبت سے اطاعت والہانہ ہوتی ہے اور وَھُوَ یَخْشٰی حال ہے اور حال بمنزل شرط کے ہوتا ہے پس یَسْعٰی کے بعد وَھُوَ یَخْشٰی فرما کر یہ بتادیا کہ محبت کے ساتھ خشیت بھی ملی ہوئی ہو کیونکہ نری محبت میں آدمی بے ادب اور گستاخ ہوجاتا ہے۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ شیخ کی محبت کو عظمت کے ساتھ جمع کرنا چاہئے۔ آیت مذکورہ میں رحمتِ الٰہیہ محبتِ الٰہیہ کو چاہتی ہے اور عظمتِ الٰہیہ خشیتِ الٰہیہ کو چاہتی ہے۔ محبت کے ساتھ خشیت کی شرط لگا کر محبت کی تکمیل کردی گئی یعنی محبتِ کاملہ وہی محبت ہے جو خشیت کے ساتھ مقرون ہو۔ جب محبت کے ساتھ خشیت مل جاتی ہے تب اس محبت کی خوشبو پھیل جاتی ہے جس طرح کباب بننے سے پہلے گوشت اور مصالحہ پسا ہوا رکھا ہوتا ہے لیکن اس کی خوشبو نہیں پھیلتی اور جب آگ پر اس کو بھونتے ہیں تو پھر اس کی خوشبو کافر کو مسلمان کرتی ہے۔ اسی طرح اللہ والوں کی محبت کے انوار خشیت کے ساتھ مل کر سارے جہان میں خوشبو پھیلا دیتے ہیں۔ ہندی مثل ہے، اس کے جرے تو کس نہ بسائے یعنی جو اس طرح جلتا ہے تو کیونکر اس کی خوشبو نہ پھیلے۔

اللہ والے نفس کی خواہشات کو مرضیاتِ الٰہیہ میں جلا دیتے ہیں یعنی تمام بری خواہشات کے تقاضوں پر اللہ کے خوف سے صبر کرتے ہیں اور اس مجاہدے کی کلفت ان کو سوختہ کردیتی ہے۔ اللہ ہی کی محبت میں روتے ہیں اور اللہ ہی کی محبت میں ہنستے ہیں۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾

(سورۃ العنکبوت، آیت: ۶۹)

جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں ان کے لیے ہم اپنے راستے کھول دیتے ہیں، اپنے بندوں کی باطنی خوشبو کو مجاہدہ سے پھیلاتے ہیں ۔

باچناں رحمت کہ دارد شاہ ہش
بے ضرورت ازچہ گوید نفس کش
اے خوشا چشمے کہ آں گریان اوست
اے ہمایوں دل کہ آں بریان اوست

وہ آنکھیں مبارک آنکھیں ہیں جو حق تعالیٰ کی یاد میں گریاں ہیں اور وہ دل مبارک دل ہیں جو ان کے عشق سے سوختہ ہیں۔

اللہ والے پہلے خود عشقِ حق سے سوختہ جان ہوتے ہیں، پھر دوسروں کو سوختہ جان کرتے ہیں ان کی صحبت میں بیٹھنے والا بزبانِ حاصلِ حال کہہ اٹھتا ہے ۔

اے سوختہ جاں پھونک دیا کیا مرے دل میں
ہے شعلہ زن اک آگ کا دریا مرے دل میں

انہی عاشقین صادقین اہل اللہ کے متعلق حضرت عارف رومی فرماتے ہیں ۔

درس شاں آشوب و چرخ و زلزلہ
نے زیادات است و باب وسلسلہ

جس طرح گوشت اور مصالحہ بغیر بھنے ہوئے کھانے کے قابل نہیں ہوتا اسی طرح محبت اسی وقت کام کی ہوتی ہے جب وہ خشیت سے مقرون ہوتی ہے اس میں ان باطل پرست مدعیانِ محبت کی تردید ہے جو جوشِ محبت میں خلافِ شرع امور کے ارتکاب پر جرأت اور اصرار کرتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ تلاوت کو حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھنا چاہیے۔ تلاوت ہی سے ان کی ایمانی کیفیت بڑھ جاتی تھی۔ حق تعالیٰ

ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَأَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ ايٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ﴾

(سورۃ اٰل عمران، آیت: ۱۰۱)

اورتم لوگ کفر کیسے کر سکتے ہو حالانکہ تم کو اللہ تعالیٰ کے احکام پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اور تم میں اللہ کے رسول موجود ہیں وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ کے بعد یہ مقدمہ محذوف ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کی تلاوت اور رسول کا وجود یہ چاہتا ہے کہ تم کفر سے باز آؤ اور آگے وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِىَ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ کا ربط موجود ہے اور جو شخص اللہ کے دامنِ رحمت پر چنگل مارتا ہے وہ بے شک ہدایت کیا گیا صراطِ مستقیم کی طرف۔ یہ ترجمہ بزبانِ محبت کا ترجمہ ہے۔

وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ فرما کر یہ بتادیا کہ تلاوتِ الٰہیہ خود اعجاز ہے، پھر ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ محبت سے جو تمہارے اندر اس وقت موجود ہیں نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ کے مصداق ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم بالکتاب والحکمۃ

تعلیمِ کتاب وحکمت قبل تزکیۂ نفس میں عجیب اسرار ہیں، قاعدہ ہے کہ قیمتی عطر جس شیشی میں رکھتے ہیں اس کو پہلے خوب صاف کر لیتے ہیں تاکہ شیشی کی گندگی عطر کو خراب نہ کرے، ہر چیز کا ظرف اس کے مظروف کی شان کے مطابق تجویز کرتے ہیں۔ جب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ہم اپنے بندوں کی شفاء کے لیے شہد پیدا فرمائیں اور شہد کی مکھیوں کو اس کارخانہ کا نظام سپرد فرمایا گیا تو ان کو سب سے پہلے حکم فرمایا کہ تم شہد جیسی لطیف نعمت کو رکھنے کے لیے پہلے گھر بنالو:

﴿وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ﴾

(سورۃ النحل، آیت: ۶۸)

آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے جی میں بات ڈالی کہ تو پہاڑوں میں گھر بنالے یعنی چھتہ بنالے اور درختوں میں بھی اور جو لوگ عمارتیں بناتے ہیں ان میں بھی۔ اسی طرح ان علوم اور معارفِ قرآنیہ کے لیے جو کہ شہد سے زیادہ شیریں اور دلوں کی بیماریوں کے لیے شفاءِ کامل عاجل مستمر ہیں حضراتِ صحابہ کے سینوں میں رکھنے کے لئے پہلے گھر بنایا گیا۔

جس برتن کی قلعی کرتے ہیں پہلے اس کی خوب منجھائی کرتے ہیں ورنہ اگر برتن پر بدون صفائی کئے ہوئے قلعی کر دیں تو قلعی کا اثر کما حقہ مرتب نہ ہوگا۔ یہ تمثیلات ہیں جن سے مقصود توضیح ہے۔

پس تعلیمِ کتاب اور تعلیمِ حکمت کے انوار سے پہلے تزکیۂ نفس ضروری ہے۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ حدیث پڑھنے کا لطف تو جبھی ہوتا ہے، جب شاگرد بھی صاحبِ نسبت ہو اور استاد بھی صاحبِ نسبت ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلاوت اور تزکیۂ نفس کے فیض سے ہر صحابی کو صاحبِ نسبت بنا کر تعلیمِ کتاب و حکمت کا صحیح اہل بنا دیا تھا۔

یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ میں تعلیم کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ارشاد فرما کر تنبیہ فرما دی کہ ہمارا رسول تمہارا معلم ہے۔ خود پڑھنے سے کام نہیں بنے گا استاد کی ضرورت ہے۔ اس میں منکرینِ حدیث کا رد ہے کیونکہ تعلیمِ کتاب اور تعلیمِ حکمت کے بغیر قرآن کا سمجھنا ممکن نہ تھا۔ اس آیت میں استدلال موجود ہے کہ قرآن کو ہمارا رسول تلاوت کرے گا۔ صرف تمہارے پڑھنے سے کام نہیں چلے گا۔ جب ہمارے رسول کی زبان سے سنو گے تب معلوم ہوگا۔ قرآن کو تعلیمِ رسول سے سمجھو گے خود نہیں سمجھو گے۔ وہ مردود ہے جو یہ دعویٰ کرے کہ ہم قرآن کو بدون تعلیماتِ رسول کے سمجھ سکتے ہیں۔ درحقیقت یہ شخص

خوش فہمی کی تعلیم اور تزکیہ کے متعلق احکام کا منکر ہے۔ آپ نے قرآنی آیات کے جو معانی اور مطالب بیان فرمائے ہیں وہی حق تعالیٰ کے مراد ہیں، باقی سب تفسیر بالرائے جو ناموافقِ شرع ہے جہنم میں پہنچانے والی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا حل

بظاہر یہاں کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ قرآن میں ایک جگہ تعلیمِ کتاب و حکمت کو تزکیہ سے مقدم فرمایا گیا ہے تو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ پارۂ الٓم میں جس مقام پر یہ تقدم مذکور ہے یہ مقام اسی تقدم کو چاہتا ہے کیونکہ یہ دعا کا موقع ہے:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ﴾

(سورة البقرة، آیت: ١٢٩)

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے دعا کی کہ اے ہمارے پروردگار اس جماعت کے اندر انہیں میں سے ایک ایسا پیغمبر بھی مقرر فرما جو ان لوگوں کو آپ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کریں اور ان کو کتاب کی اور خوش فہمی کی تعلیم دیا کریں اور ان کو پاک کردیں اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ بلاشبہ آپ ہی غالب القدرۃ، کامل الانتظام ہیں۔

اور مقامات پر تزکیہ کو مقدم فرمایا گیا ہے کیونکہ موقعِ امتنان اسی امر کو مقتضی ہے۔ کلام کا مقتضیٰ حال کے مطابق ہونا ہی کلام کی بلاغت ہے۔ حق تعالیٰ نے تعلیم اور تزکیہ کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ فرما کر اپنی رفعتِ شان بیان فرمادی کہ درحقیقت معلم اور مزکّی ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ کی تعلیم اور تزکیہ کا کمال یہ ہے کہ آپ کے شاگردوں کی اتباع

کرنا عینِ رسول کے حکم میں ہو گیا وَالَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُمۡ بِاِحۡسَانٍ اور وہ لوگ جنہوں نے حضراتِ صحابہ کی تابعداری کی اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان سے بھی راضی ہو گئے، یعنی ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین جس طرح رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُ وَرَضُوۡا عَنۡهُ کے مستحق ہو گئے اسی طرح ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں کے شاگرد بھی اس خطاب کے مستحق ہو گئے۔

وَالَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُمۡ کے اندر جو ضمیر ہے اس سے مراد حضرات صحابہ رضوانُ اللہ علیہم اجمعین ہیں حق تعالیٰ نے یہاں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بدون واسطہ متبوع فرمایا ہے۔ اسی آیت میں حق تعالیٰ نے سلسلے کی بنیاد ڈالی ہے۔ شاگردوں کو اپنے اپنے استاد اور مرشد کے فیض سے متبوع ہونے کا اور ان کی تابعداری کا سلسلہ جاری ہونے پر اس آیت کی دلالت ظاہر ہے۔

کتاب کا نفع صحبت پر موقوف ہے

کتاب کا نفع صحبت پر موقوف ہے:

﴿قَدۡ جَآءَ كُمۡ مِنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّكِتَابٌ مُّبِيۡنٌ﴾

(سورۃ المائدۃ، آیت: ۱۵)

میں حق تعالیٰ نے نور کو مقدم فرمایا ہے نور سے مراد ذاتِ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہے، نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے انعام اور احسان کو اپنی کتاب کے انعام اور احسان سے پہلے بیان فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی اہمیت ظاہر فرمادی۔

حق تعالیٰ نے چالیس برس تک اپنے اس نور کو دکھایا ہے۔ ۴۰ برس کے بعد تب کتاب نازل ہوئی۔ آپ کی ذاتِ پاک نور تھی مگر اس نور کو کوئی دیکھنے کی قدرت نہ رکھتا، نور کو تو نور ہی دیکھ سکتا ہے۔ جس پر ظلمت اور مادیت کا غلبہ ہو

وہ نور کا تحمل نہیں کر سکتا اس لئے حق تعالیٰ نے نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پردۂ جسد میں رکھ کر دنیا میں مبعوث فرمایا تا کہ خاکی اور مادی نگاہیں اس نور پر ٹھہر سکیں اور رسالت کا مقصد پورا ہو سکے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ پاک لوگوں کو حق تعالیٰ کی طرف جاذب تھی۔

نورِ حقی و بحق جذاب جان
خلق در ظلمات وہم و بدگمان

پس نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حکمت کی تکمیل کے لیے پردۂ بشریت میں بھیجا مگر ہر شے کا پردہ صاحبِ پردہ کی عزت اور قیمت کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ آپ کی قیمت ظاہر ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ آپ کی خمیر کے لئے حق تعالیٰ شانہٗ نے کرۂ زمین کے اجزائے لطیف کو منتخب فرمایا، یہ اجزاء اس قدر لطیف تھے کہ ان سے زیادہ لطیف اجزاء ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ کسی مخلوق کو وہ لطافت نہیں دی گئی، پہلے ہی سے یہ اجزاء آپ کے لیے منتخب فرمالئے گئے تھے، پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خمیر کے اجزاء لطیفہ اس قدر لطیف تھے کہ صرف خاک کے ہمرنگ تھے ورنہ بوجہ غایت لطافت نور سے اقرب واشبہ تھے، اس نور کے ذریعہ کتاب کی تلاوت اور تلبین کرائی جائے گی۔ تلاوت اور تلبین میں فرق ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾
(سورۃ النحل، آیت: ۴۴)

ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہماری آیاتِ قرآنیہ کو لوگوں سے بیان فرماتے ہیں، ایسے علوم بیان فرماتے ہیں کہ علماءِ یہود و نصاریٰ دنگ رہ جاتے ہیں۔

یتیمے کہ ناکردہ قرآن درست
کتب خانۂ چند ملت بشست

ابھی قرآن پورا اترا بھی نہ تھا کہ تمام کتب خانے اس اُمّی رسول کے سامنے سرد پڑ گئے۔ حضرت عارف فرماتے ہیں کہ ؂

صد ہزاراں دفتر اشعار بود
پیش حرف اُمّیش آں عار بود

اہلِ عرب کے سینکڑوں اشعار کے دفاتر اس اُمّی رسول کے سامنے شرمندہ ہو کر رہ گئے۔ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم تلاوتِ قرآن فرماتے تھے تو حق تعالیٰ کی رحمت تھی کہ جانیں نہیں نکلتی تھیں، دلوں کو سنبھال دیتے تھے۔ ورنہ اگر جنازے ہی نکلتے تو پھر اسلام کن سے پھیلتا۔

قرآن کے مقابلہ میں حق تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا کہ اچھا اس کتاب کے مثل تم کوئی کتاب لاؤ پھر ارشاد فرمایا کہ اچھا دس ہی آیات اس کے مثل لاؤ پھر ارشاد فرمایا اچھا ایک محدود ٹکڑا ہی اس کے مثل لاؤ۔ سبحان اللہ اس تدریجی نزول میں کس قدر بلیغ انداز سے مشرکینِ عرب کو شکست دی گئی ہے۔

اس تدریج میں کس قدر لاگ دھرا گیا ہے۔ دنیا میں اللہ کو نہیں دیکھا لیکن اللہ کے کلام کو دلیل سے دیکھ لیا۔ بس گویا کہ اللہ کو دیکھ لیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حیاتِ دنیویہ ہی میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ یہ شرف بنی نوع انسان میں کسی کو حاصل نہیں تھا۔ آپ کے خمیر کے اجزائے لطیفہ ایسے لطیف تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام صفاتِ ملکوتیت کے باوجود فرماتے ہیں کہ اے سید الرسل اب اس کے آگے سر مو اگر بڑھوں گا تو میرے پر جل جائیں گے ؂

اگر یک سرموے برتر پرم
فروغِ تجلی بسوزد پرم

ایک اشکال اور اس کا حل

بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ سے اہلِ رسم کیوں گھبراتے ہیں! اس مثلیت سے تو آپ کی شانِ رفیع کا ثبوت مل رہا ہے۔ اگر یہ مثلیت نہ ہوتی تو کسی کو ہدایت نہ ہوتی اور آپ سے منصبِ رسالت کا حق ادا نہ ہوتا، کیونکہ بدون اس پردہ اور غلافِ مثلیت کے حضرات صحابہ رضوانُ اللہ علیہم اجمعین نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی تاب نہ لا سکتے۔ جب فرشتوں کے نور میں حق تعالیٰ نے اس قدر سَوْرۃ اور قوۃ رکھی ہے کہ اصلی حالت میں کوئی انسان اس نور کا تحمل نہیں کر سکتا جیسا کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر میں کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتا تو تمہارا کام ہی تمام ہو جاتا یعنی تم سب کے سب ہلاک ہو جاتے:

﴿وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ﴾

(سورۃ الانعام، آیت:۸)

پس نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی تابش کا تحمل تو کسی سے کیا ہوتا۔ اس لئے حق تعالیٰ شانہٗ نے انوارِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کو غلافِ بشریت میں مبعوث فرمایا۔ اور میں اس مثلیت پر ایک مثال یہ بھی دیا کرتا ہوں کہ ایک درجن گلاس رکھے ہوں اور ان میں ایک گلاس مٹی کا ہو اور ایک پتھر کا ہو ایک چاندی کا ہو ایک سونے کا ہو ایک ہیرے کا ہو اور ایک گلاس ایسا ہو جو ایسے انمول جواہرات سے تیار کیا گیا ہو جس کی قیمت اور جس کا مثل دونوں جہاں میں نہ ہو تو بظاہر مثلیت میں ہر گلاس کو گلاس کہہ دیں گے اور یہ انمول گلاس بھی دوسرے معمولی گلاسوں سے کہہ سکتا ہے کہ اَنَا مِثْلُکُمْ میں بھی تمہاری طرح نفسِ گلاس ہونے میں تمہارا ہم مثل ہوں لیکن ہم ایسے مثل ہیں کہ تمہاری قیمت صرف چند پیسے ہوں گے اور ہماری قیمت دونوں جہاں میں کوئی ادا نہیں کر سکتا یُوْحٰی اِلَیَّ نے اس مثلیت کو اس قدر رفعت بخشی ہے کہ اس رفعت کا تفصیلی علم خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہ

تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی کو اپنے رسول کی قیمت اور رفعت کا تفصیلی علم ہے۔

عظمتِ اُلوہیت سے عظمتِ رسالت پر استدلال

بات یہ ہے کہ ہر سفیر کی عظمت اور رفعت شان اس ملک کے بادشاہ کی عظمت کے لحاظ سے ہوتی ہے، پس حق تعالیٰ کی عظمت خود عظمتِ رسالت پر دلالت ہے۔ شہنشاہ کی عظمت اس کے رسول کو معظم کر دیتی ہے، اس عنوان کو حق تعالیٰ نے ایک جگہ اختیار فرمایا ہے۔ **محمد رسول اللہ** فرماتے ہیں کہ ہمارے رسول کی شان کو سمجھنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تم یہ جان لو کہ یہ کس ذاتِ پاک کے رسول ہیں، میری کبریائی وجلالتِ شان سے میرے رسول کی جلالت شان کو سمجھ لو، تین لفظ میں عجیب نظم ہے۔ محمد۔ رسول۔ اللہ یہ مختصر سا ٹکڑا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعریفوں کو جامع بھی ہے اور مانع بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اللہ کے رسول ہیں تو تمام صفاتِ رسالت سے آراستہ ہونا یقینی ہے۔ پس اس جامع اور مانع تعریف کو اس محدود ٹکڑے کے اندر حق تعالیٰ نے سمو دیا۔

تفصیلِ شانِ رسالت آئینۂ رسالت میں

اب اس آیت کے بعد حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اس اجمالی تعریف کے بعد اگر میرے رسول کی تفصیلی شان دیکھنی ہو تو میرے رسول کو آئینۂ رسالت میں دیکھو یعنی حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھو۔ شاگردوں کی عظمتِ شان سے استادوں کی عظمتِ شان معلوم کر لو:

﴿وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾

(سورۃ الفتح، آیت: ۲۹)

دیکھو یہ جو ہمارے رسول پاک کی صحبت میں تربیت پا رہے ہیں، یہ پہلے تو کفر اور شرک کو محبوب سمجھتے تھے، اور اب کفر اور شرک سے کیسی عداوت اور بغض ہے کہ جان دینے اور لینے کے لیے تیار ہیں اور پہلے آپس میں کس درجہ عداوت و

بغض کی آگ نسلاً بعد نسل چلتی رہتی تھی اور ان کے کینے وسخت دلی اور انتقام پر صفحات تاریخ بھرے ہوئے ہیں، اب میرے رسول پاک کی معیت نے ان کو آپس میں رحم دل بنا دیا۔ یہ تو بندوں کے ساتھ ان کا معاملہ ہے۔ اب اپنے اللہ کے ساتھ ان کا معاملہ دیکھو تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا مراد رکوع وسجدے سے نماز ہے مگر نماز نہیں فرمایا یہ بھی بلاغت ہے یعنی ہر رکن میں اپنے اللہ سے ایک مستقل مشغولی ہے۔ رکوع میں ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اب سر ہی نہ اٹھے گا، دیکھنے والا سمجھے کہ شائد یہی ایک ان کا کام ہے، سجدے میں ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سجدے ہی میں رہیں گے ۔

میں ہوں اور حشر تک اس در کی جبیں سائی ہے
سر زاہد نہیں یہ سر سرسودائی ہے

عجیب بلاغت ہے، صرف رکوع اور سجدہ کو بیان فرما کر یہ بتا دیا کہ کمال عظمت حق و کبریائی ان کے پیش نظر ہے اور غلبۂ انہماک وشغف پر نیز غایت درجہ مطیع ہو جانے پر بھی لطیف اشارہ ہے۔

جن کے قلوب کفر اور شرک سے مردہ تھے، ان قلوب میں معیت اور صحبتِ رسول پاک نے کیسی ایمانی حیات بخشی ہے کہ ہر فرد عشقِ الٰہی سے کشتہ نظر آ رہا ہے۔ دن میں ہاتھوں میں تلوار ہے، اور چپکے چپکے بزبانِ حال کہہ رہے ہیں کہ

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

میدان جہاد ہے اور سر میدان کفن بردوش دارم کے نعرے بلند ہو رہے ہیں اور راتوں میں کیا ہو رہا ہے؟ رکوع اور سجدے میں عظمتِ الٰہی کے سامنے جھکے ہوئے ہیں، آدھی رات ہے، سارے عالم میں سناٹا ہے مگر اس رات کے سناٹے میں یہ معیتِ رسول کے پروردہ چرخ انسانیت کے اختر اپنے اللہ کو یاد کر کے رو رہے ہیں، گویا ہر صحابی بزبانِ حال ناطق ہے کہ ۔

اب اور ہی کچھ ہے مرے دن رات کا عالم
ہر وقت ہے اک ان سے مناجات کا عالم
اک بے تعلقی سی بس اب ہر کسی سے ہے
اک ربط مستقل جو میسر کسی سے ہے
اے وہ کہ جس نے خلق سے آزاد کردیا
امید ہے کسی سے نہ اب ڈر کسی سے ہے

اور یہ تمام اعمال یعنی شدت علی الکفار اور رحمت فیما بینہم اور یہ رکوع سجدے کس غرض کے لیے ہیں؟ اللہ تعالیٰ ان کے صدق اور اخلاص کی شہادت میں فرمار ہے ہیں کہ یہ اپنے تمام کارناموں سے صرف میرا فضل اور صرف میری رضاء ڈھونڈتے رہتے ہیں اور ان کے صدق و اخلاص کا نور ان کے چہروں سے سے نمایاں ہو رہا ہے۔ سِیۡمَا هُمۡ فِیۡ وُجُوۡهِهِمۡ مِنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ.

یہ برکات اور فیوض ان حضرات کو کس کی صحبت پاک سے حاصل ہوئے تھے اس کو حق تعالیٰ نے وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗ میں بتادیا ہے، اس مَعَهٗ کے اندر نجانے حق تعالیٰ نے کیا اعجاز رکھا ہے جو وہ مصداق ؎

آہن کہ بپارس آشنا شد
فی الفور بصورت طلا شد

ان تمام تفصیلات پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عالم کے لیے کتنا بڑا انعام ہے۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو آپ کی معیت وصحبت پاک سے جو کچھ انعامات اور فیوض حاصل ہوئے ہیں وہ اس قدر مہتم بالشان ہیں کہ حق تعالیٰ نے اپنے رسولِ پاک کی بعثت کے ساتھ ساتھ انہیں بھی موقعِ امتنان میں ذکر فرمایا۔

رسالت کی قیمت کا علم صرف اللہ کو ہے، انوارِ رسالت کی قیمت کا علم

صرف اللہ کو ہے۔ انوارِ رسالت کی قیمت کو دنیا والے نہیں جانتے۔ صفتِ رسالت عجیب صفت ہے، بندہ اور اللہ کے درمیان ایک خاص تعلق کا نام ہے۔ رسالت کے نور کو انسانی شکل میں ڈھال دیا جاتا ہے۔ اس بشر کی قیمت نہ پوچھئے، یہ بشر صاحب وحی ہوتا ہے۔ عام انسانوں سے صورت مماثل ضرور ہیں مگر چراغ مردہ کجا شمع آفتاب کجا کا معاملہ ہے۔

بالخصوص حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو امام الرسل ہیں، آپ تو عام انسانوں کے علاوہ رسولوں میں بھی ممتاز ہیں۔ امامت بمعنی بادشاہت ہے آپ بادشاہِ رسل ہیں اور اور انبیاء علیہم السلام نے جو کام کئے ہیں وہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت و نیابت میں استخلاقاً ہوئے ہیں۔ یہی راز ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿نَحْنُ السَّابِقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾

(صحیح ابن حبان، کتابُ الصلوٰة، باب صلوٰة الجمعة)

ہمیں سے نبوت شروع ہوئی ہے اور ہمیں پر نبوت ختم ہوئی۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

﴿اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِىْ﴾

(مرقاة المفاتيح، كتاب الايمان، باب الايمان بالقدر)

یعنی حق تعالیٰ نے تمام مخلوقات سے پہلے مجھے اپنے نور سے پیدا فرمایا۔ اس میں دوسرے حضرات انبیاء علیہم السلام کی تنقیص نہیں ہے کیونکہ امام اور مقتدی کا مقابلہ کہاں ہوتا ہے۔ حدیث قدسی میں ہے کہ:

﴿لَوْلاَکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلاَکَ﴾

(تفسير روح المعانى، ج: ۳۰)

عادۃ اللہ یہی ہے کہ پہلے ایک مرکز بناتے ہیں پھر اسی مرکز سے بہت سے افراد نشر فرماتے ہیں۔ دنیا میں ہر چیز کا ایک مرکز نکلتا ہے۔ تمام بنی نوع

انسان کا مرکز حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا۔ اسی طرح اور بھی مثالیں ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک کو موجودات ومخلوقات کا مرکز بنایا ہے، اگر آپ نہ پیدا ہوتے تو یہ آسمان وزمین کچھ نہ ہوتے۔ مرشدی حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے نشر الطیب میں ایک روایت نقل فرمائی ہے جس کے اندر یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نور مبارک حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے ۱۴ ہزار برس پہلے پیدا ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے انوارِ رسالت ونبوت کا مرکز بنایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انوارِ نبوت نشر ہوئے اور آپ کو مرکز بنایا گیا انوارِ نبوت ورسالت کا۔

جس طرح ہر محکمہ کا ایک افسر ہوتا ہے، محکمۂ ارسال انبیاء میں آپ سب کے افسر ہیں۔ ایک دانے سے حق تعالیٰ کتنا عظیم القامت درخت پیدا فرماتے ہیں۔ آپ کا نور پاک سارے عالم کے لیے مثلِ بیج کے ہے، ہر ذرۂ کائنات کو وجود اور بقاء آپ ہی کے نورِ پاک کے فیض سے حاصل ہوا ہے۔ آپ کا وجودِ پاک ہر نبی اور رسول کے لیے بھی رحمت ہے، عالم کا ہر ذرہ آپ کی رحمت کا مرہون وممنون ہے، اللہ تعالیٰ رحمٰن ہیں، آپ رحمت ہیں اور تمام عالم مرحوم ہے۔

مجموعی طور پر تمام مخلوقات افلاک، زمین، چاند، ستارے، سورج، ہوا، دریا، پہاڑ، ملائکہ، انسان، جن وبشر، چرند وپرند سب کا صرف ایک بیج ہے۔ وہ بیج نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ایک نقطہ سے سارا عالم پیدا ہوا اور وہ نقطہ آپ کا نورِ پاک ہے۔ نَحْنُ السَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ الخ کا یہی مفہوم ہے۔

ہر چند کہ آخر بظہور آمدہ
پیش از ہمہ شاہان غیور آمدہ
اے ختمِ رسل قرب تو معلومم شد
دیر آمدۂ ز راہ دور آمدہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نورِ پاک حاصلِ وجود وعلم ہے۔ آپ اپنے وجود باوجود میں نورِ نبوت لیے ہوئے تھے۔ نور اور علم مترادف ہے۔ نور کی شان ظاہر بنفسہ اور مظہر لغیرہٖ ہے اور علم کی بھی یہی شان ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے اندر آپ ہی کا نورِ نبوت درخشاں تھا۔ تمام انبیاء علیہم السلام میں آپ ہی کا نورِ نبوت منتقل ہوتا چلا گیا تھا اور آپ کے نورِ پاک پر نبوت آکر ختم ہوگئی۔ آپ ہی کا نور اوّل تھا اور آپ ہی کا نور آخر ہوا۔ کوئی دوسرا نور نہ تھا، صرف قالب مختلف تھے، نورِ محمدی وہی روحِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم تھی۔ نبوت کی صفت اسی روحِ محمدی کو عطا ہوئی تھی اور یہی روحِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سابقون وآخرون کی مصداق ہے۔ آپ پر ختمِ نبوت کی مہر لگادی گئی کیونکہ جب کسی کام کو ختم کرتے ہیں تو مہر لگادی جاتی ہے۔ یعنی آپ پر سلسلۂ نبوت ختم کردیا گیا۔ ختمِ نبوت سے آپ کی رفعتِ شان ظاہر ہوتی ہے۔ آپ کی رفعتِ شان کو کیا پوچھنا ہے، جب کہ میاں نے فرمادیا وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ اللہ تعالیٰ جن کے ذکر کو بلند فرمائیں تو پھر مذکور کی رفعتِ شان کیا ہوگی۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسئلۂ ختمِ نبوت کی ضرورت کیا تھی؟ تو اس کا ایک علمی جواب ہے، وہ یہ ہے کہ مخلوقات کی ہر صفت کو انتہا لازم ہے اور صفاتِ الٰہیہ غیر متناہی ہوتے ہیں، اس اصل کی بناء پر سلسلۂ نبوت کا ختم عقلاً ضروری ہے ورنہ صفتِ مخلوق کا لامتناہی ہونا لازم آوے گا اور یہ محال ہے، یوں تو ہر نبی کی نبوت میں ایک ابتداء ہے پھر اس کی انتہا ہے، مگر ان حضرات انبیاء علیہم السلام کی نبوت کی ابتداء اور انتہاء امورِ اضافیہ سے ہے ابتداءِ حقیقی اور انتہاءِ حقیقی اور چیز ہے جو صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاص ہے۔ پس حق تعالیٰ شانہٗ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو کَآفَّةً لِلنَّاسِ فرما کر بتادیا کہ نبوت اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئی۔ اس سے پہلے ہر نبی الگ الگ قوم اور الگ الگ قریہ کے لیے مبعوث ہوتے تھے مگر آپ کی نبوت کو تمام روئے زمین

کے انسانوں کے لیے عام فرمایا، آپ کی امت کو خیر الامم فرمایا، آپ کی امت کے علماء رتبے میں مثل انبیاء بنی اسرائیل ہیں۔ آپ کی شان رحمت اللعالمین ہے اور عالم کہتے ہیں جملہ ماسواء اللہ کو۔ عالم میں ماضی اور مستقبل اور حال سب داخل ہے، پس ہر نبی کی اپنے اپنے زمانے میں جو رحمت ہوئی وہ دراصل آپ ہی کی رحمت تھی۔ وجودِ عالم اپنے وجود میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا ممنون ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے خمیر میں آپ ہی کا نور تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿كُنْتُ نَبِيًّا وَّ اٰدَمُ بَيْنَ الْمَآءِ وَالطِّيْنِ﴾

(مرقاةُ المفاتيح، کتابُ الفضائل والشمائل، باب فضائل سید المرسلین)

میں نبی اس وقت بھی تھا جب کہ حضرت آدم علیہ السلام کا پتلا مٹی اور پانی کے درمیان تھا۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾

(سورۃ الاحزاب، آیت: ۴۰)

اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُبوّۃِ روحانی کا ثبوت ہے کیونکہ لٰکِنْ کا استعمال تو ہم ناشی عن کلام السابق کے لیے ہوتا ہے اور اُبوّۃِ نسبی کا شبہ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ سے ختم ہو گیا پھر ظاہر ہے کہ لٰکِنْ کا استعمال کیوں اختیار کیا گیا یعنی لٰکِنْ سے اُبوّۃ باطنی ثابت ہو گئی لٰکِنْ کا لفظ چاہتا ہے کہ کلام ماسبق میں اُبوّۃ کا تو ہم ثابت ہو اور چونکہ اُبوّۃ ظاہری کی نفی مَا كَانَ مُحَمَّدٌ سے ثابت ہے پس اُبوّۃ باطنی کو ثابت ماننا ضروری ہے۔

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا
عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمٖ

کتابُ القیامت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحۡمَدُهٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِهِ الۡکَرِیۡمِ اَمَّا بَعۡدُ!

فَاَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿عَمَّ یَتَسَآءَلُوۡنَ ۝ اِلٰی قَوۡلِهٖ...... وَجَنّٰتٍ اَلۡفَافًا ۝﴾

(سورۃ النبآء، پارہ ۳۰)

دلائلِ امکانِ قیامت

(تحقیق بعث امکاناً ووقوعاً از تفسیر بیانُ القرآن)

ترجمہ و تفسیر از بیان القرآن: حق سبحانہٗ تعالیٰ شانہٗ ارشاد فرماتے ہیں یہ قیامت کے دن کا انکار کرنے والے لوگ کس چیز کا حال دریافت کرتے ہیں۔ اس بڑے واقعہ کا حال دریافت کرتے ہیں جس میں یہ لوگ اہلِ حق کے ساتھ اختلاف کررہے ہیں مراد قیامت ہے اور دریافت کرنے سے مراد بطور انکار کے دریافت کرنا ہے اور مقصود اس سوال و جواب سے اذہان کا ادھر متوجہ کرنا اور تفسیر بعد الابہام سے اس کا اہتمام شان ظاہر کرنا ہے۔ آگے ان کے اختلاف کی تزییف اور ابطال ہے کہ جیسا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ قیامت نہ آوے گی، ہرگز ایسا نہیں بلکہ قیامت آوے گی اور ان کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے یعنی جب بعد فراق دنیا کے ان پر عذاب واقع ہوگا تب حقیقت اور حقیقتِ قیامت منکشف ہوجاوے گی اور ہم پھر مکرر کہتے ہیں کہ جیسا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ قیامت نہ آوے گی ہرگز ایسا نہیں بلکہ آوے گی اور ان کو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے اور چونکہ وہ لوگ اس کو مستبعد یا مستحیل سمجھتے ہیں آگے اس کا امکان وصحتِ ارشاد ہے کہ اس کو ممتنع

سمجھنے سے ہماری قدرت کا انکار لازم آتا ہے۔ اور ہماری قدرت کا انکار نہایت عجیب ہے کیونکہ کیا ہم نے زمین کو فرش اور پہاڑوں کو زمین کی میخیں نہیں بنایا یعنی مثل میخوں کے بنایا جیسا کسی چیز میں میخیں لگا دینے سے وہ چیزیں اپنی جگہ سے نہیں ہلتی اسی طرح زمین کو پیاڑوں سے مستقر کر دیا جس کو دوسری آیت میں رواسی سے تعبیر فرمایا ہے (وَقَدْ مَرَّ فِيْ سُوْرَةِ النَّحْلِ) اور اس کے علاوہ ہم نے اور بھی دلائل قدرت ظاہر فرمائے چنانچہ ہم ہی نے تم کو جوڑا جوڑا (یعنی مرد و عورت) بنایا اور ہم ہی نے تمہارے سونے کو راحت کی چیز بنایا اور ہم ہی نے رات کو پردہ کی چیز بنایا اور ہم ہی نے دن کو معاش کا وقت بنایا اور ہم ہی نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے اور ہم ہی نے آسمان میں ایک روشن چراغ بنایا (مراد آفتاب ہے لِقَوْلِهٖ تَعَالٰی وَ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا) اور ہم ہی نے پانی بھرے بادلوں سے کثرت سے پانی برسایا تاکہ ہم اس پانی کے ذریعہ غلہ، سبزی اور گنجان باغ پیدا کریں اور ان سب سے ہمارا کمالِ قدرت ظاہر ہوتا ہے پھر قیامت پر ہمارے قادر ہونے کا کیوں انکار کیا جاتا ہے۔ یہ بیان تھا امکان کا آگے وقوع کا ذکر ہے۔

﴿اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا٥

اِلٰى قَوْلِهٖ تَعَالٰى

وَ يَقُوْلُ الْكَافِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرَابًا٥﴾

(سورۃ النبآء، پارہ ٣٠)

دلائلِ وقوعِ قیامت

از تفسیر بیان القرآن: حق سبحانہٗ وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ بے شک فیصلہ کا دن ایک معین وقت ہے یعنی جس دن سور پھونکا جاوے گا پھر تم لوگ گروہ گروہ ہو کر آؤ گے یعنی ہر امت جدا جدا ہوگی پھر مومن جدا کافر جدا پھر ابرار جدا

اشرار جدا۔ سب ایک دوسرے سے ممتاز ہوکر میدان قیامت میں حاضر ہوں گے اور آسمان کھل جاوے گا پھر اس میں دروازے ہی دروازے ہوجاویں گے (یعنی) اس قدر بہت سا کھل جاوے گا جیسے بہت سے دروازے ملا کر بہت سی جگہ کھلی ہوتی ہے پس کلام مبنی ہے تشبیہ پر اب یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ دروازے تو آسمان میں اب بھی ہیں پھر اس دن دروازے ہونے کے کیا معنیٰ۔ اور یہ کھلنا نزولِ ملائکہ کے لیے ہوگا جیسا سورۂ فرقان میں تَشَقَّقُ السَّمَآءُ سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کی شرح وہاں گذری ہے) اور اپنی جگہ سے پہاڑ ہٹا دیئے جائیں گے سووہ ریت کی طرح ہوجائیں گے وَلِقَوْلِهٖ تَعَالٰی كَثِيْبًا مَّهِيْلًا اور یہ واقعات نفخۂ ثانیہ کے وقت ہوں گے۔ البتہ تسیرِ جبال میں یہاں بھی اور جہاں جہاں واقع ہو دونوں احتمال ہیں یا تو نفخۂ ثانیہ کے بعد کہ اس سے سب عالم بِهَيْئَتِهٖ عود کر آوے گا۔ جب حساب کا وقت آوے گا پہاڑوں کو زمین کے برابر کردیا جائے گا تا کہ زمین پر کوئی آڑ پہاڑ نہ رہے سب ایک ہی میدان میں نظر آویں کہ اَدْخَلُ فِي الْهَيْبَةِ ہے اور یا یہ نفخۂ اولیٰ کے وقت ہوگا۔ جس سے خود افنا مقصود بالذات ہوگا پھر اس تقدیر پر یوم کو ان سب واقعات کا ظرف فرمانا اس بنا پر ہوگا کہ نفخۂ اولیٰ سے نفخۂ ثانیہ تک کا مجموعہ ایک یوم قرار دے لیا گیا۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

آگے اس یوم الفصل میں جو فیصلہ ہوگا اس کا بیان ہے۔ یعنی بے شک دوزخ ایک گھات کی جگہ ہے یعنی عذاب کے فرشتے انتظار اور تاک میں ہیں کہ کافر آویں تو ان کو پکڑتے ہی عذاب کرنے لگیں اور وہ سرکشوں کا ٹھکانہ ہے جس میں وہ بے انتہا زمانوں پڑے رہیں گے اور اس میں نہ تو وہ کسی ٹھنڈک یعنی راحت کا مزہ چکھیں گے اور اس سے زمہریر کی نفی نہیں ہوئی اور نہ پینے کی چیز کا جو کہ مسکن عطش ہو بجز گرم پانی اور پیپ کے یہ ان کو پورا بدلہ ملے گا اور وہ اعمال جن کا یہ بدلہ ہے یہ ہیں کہ وہ لوگ حسابِ قیامت کا اندیشہ نہ رکھتے تھے اور

ہماری ان آیتوں کو جن میں حساب ودیگر امور حقہ کی خبر تھی خوب جھٹلاتے تھے اور ہم نے ان کے نامۂ اعمال میں سے ہر چیز کو ان کے نامۂ اعمال میں لکھ کر ضبط کر رکھا ہے سو ان اعمال پر ان کو مطلع کر کے کہا جاوے گا اب ان اعمال کا مزہ چکھو کہ ہم تم کو سزا ہی بڑھاتے چلے جائیں گے۔ یہ تو کافروں کا فیصلہ ہوا آگے اہلِ ایمان کا فیصلہ مذکور ہے کہ خدا سے ڈرنے والوں کے لیے بے شک کامیابی ہے یعنی کھانے اور سیر کو باغ جن میں طرح طرح کے میوے ہوں گے اور انگور (یہ تخصیص بعد التعمیم اعتناءِ شان کے لیے ہے) اور دل بہلانے کو نو خاستہ ہم عمر عورتیں ہیں اور پینے کو لبالب بھرے ہوئے جام شراب اور وہاں نہ کوئی بے ہودہ بات سنیں گے اور نہ جھوٹ کیونکہ یہ باتیں وہاں محض معدوم ہیں یہ تو ان کو نیکیوں کا بدلہ ملے گا جو کہ کافی انعام ہوگا آپ کے رب کی طرف سے جو مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان چیزوں کا جو دونوں کے درمیان میں اور جو رحمان ہے اور کسی کو اس کی طرف سے مستقل اختیار نہ ہوگا کہ اس کے سامنے عرض ومعروض کر سکے۔ یہاں کئی صفتیں ارشاد ہیں رَبِّ السَّمٰوٰتِ الخ جو دال ہے مالک تصرفات واقعہ یوم قیامت پر اور رحمان جو مناسب ہے جزائے مؤمنین کے اور لَا یَمْلِکُوْنَ الخ جو مناسب ہے تخویف کافرین کے اور مستقل کی قید پر آگے استثناء اِلَّا مَنْ اَذِنَ الخ دلیل ہے آگے تقریر ہے لَا یَمْلِکُوْنَ الخ کی یعنی جس روز تمام ذی ارواح اور فرشتے خدا کے روبرو صف بستہ خشوع و خضوع کے ساتھ کھڑے ہوں گے اس روز کوئی بول نہ سکے گا بجز اس کے جس کو رحمان بولنے کی اجازت دے دے اور وہ شخص بات بھی ٹھیک کہے۔ ٹھیک بات سے مراد وہ بات جس کی اجازت دی گئی ہے یعنی بولنا بھی محدود ومقید ہوگا۔ یہ نہیں کہ جو چاہے بولنے لگے اور مستقل اختیار سے اوپر یہی مراد ہے۔ آگے اوپر کے تمام مضامین کا خلاصہ ہے کہ یہ دن جس کا اوپر ذکر ہوا یقینی دن ہے سو جس کا جو

جی چاہے اس کے حالات سن کر اپنے رب کے پاس اپنا ٹھکانا بنا رکھے یعنی نیک عمل کرے کہ وہاں نیک ٹھکانہ ملے گا۔ آگے اتمام حجت ہے کہ لوگو! ہم نے تم کو ایک نزدیک آنے والے عذاب سے ڈرایا ہے جو کہ ایسے دن میں واقع ہونے والا ہے جس دن ہر شخص ان اعمال کو اپنے سامنے حاضر دیکھ لے گا جو اس نے اپنے ہاتھوں کیے ہوں گے اور کافر حسرت سے کہے گا کاش میں مٹی ہو جاتا۔ (تاکہ عقاب سے بچتا اور یہ اس وقت کہے گا جب بہائم مٹی کر دیئے جاویں گے رواہ فی الدر عن ابی ہریرۃ یا وہ معنٰی مراد ہوں جو سورۃ النساء لَوْ تُسَوّٰی بِهِمُ الْاَرْضُ میں گذرے ہیں) (بیان القرآن پارہ ۳۰، سورۃ النباء)

حق تعالیٰ شانہٗ نے اثباتِ قیامت کے متعلق متعدد عنوانات سے میرے قلب میں مضامین القاء فرمائے ہیں اور یہ سب کچھ حضرت مرشدی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا فیض ہے، زبان میری ہے اور دل ان کا ہے۔

تقریرِ اثباتِ قیامت بعنوانِ اوّل

مأخذ اس استدلال کا آیتِ کریمہ ہے:

﴿اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحَاكِمِيْنَ﴾

(سورۃُ التین، آیت: ۸)

دنیا میں آپس کے نزاعی معاملات کا صحیح فیصلہ کرانے کے لیے چھوٹی عدالتوں سے بڑی عدالتوں کی طرف رجوع کیا کرتے ہیں حتّٰی کہ اہلِ مقدور فرمانِ شاہی تک پہنچ جایا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی صحیح فیصلے نہیں ہوتے ہیں اور مظلوم صبر کر کے بیٹھ جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ حکام کو معاملات کی صحیح حقیقت کا پتہ نہیں چلتا۔ حکام مجبور ہیں کہ وہ گواہوں کی شہادت پر فیصلہ کر دیں۔

پس گواہوں کی جھوٹی شہادت حکام کی رشوت خوری، وکلاء کی غلط وکالت کا انجام یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں لاکھوں مظلومین کے فیصلے صحیح نہیں ہوتے

اوران کے حقوق پامال کردیئے جاتے ہیں اوراسی مظلومی کی حالت میں آہِ مظلومی لیے ہوئے اپنے پروردگار کی طرف چل دیتے ہیں۔ کسی نے کسی کی جائیداد غصب کررکھی ہے، کسی نے کسی کا مال چوری کرلیا، کسی نے کسی کوقتل کرکے اس کے بچوں کو یتیم اور بیوی کو بیوہ کردیا ہے۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ جب ان مظلومین کے فیصلے دنیا کی تمام عدالتوں میں صحیح نہ ہوسکے اوران کے حقوق ان کو نہ مل سکے تو ان مظلومین کی آہیں آخر کہاں جائیں گی؟ اگران آہوں کا سننے والا اوران فریادِ مظلومان کا خریدار کوئی نہیں ہے تو عقلاً اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ خالقِ حقیقی نے مخلوقات کو پیدا کردیا لیکن عدل وانصاف کا انتظام نہ فرمایا پس حق تعالیٰ کی شانِ عدل کا مقتضاء ہے کہ ایک دن ایسا مقرر کیا جاوے جس میں تمام مظلومین کے صحیح فیصلے ہوں اوران کے تمام حقوق ان کو دیئے جائیں۔ اسی استدلال کو حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ بندوں کے اس اضطراری سوال کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ تمہاری آہوں کے سننے والے ہم موجود ہیں۔ ابھی دنیا کی فرمان شاہی عدالت سے بھی ایک بڑی عدالت ہماری موجود ہے، ہمیں گواہوں کی جھوٹی شہادتوں وکیلوں کی جھوٹی بحثوں اور حکام کے غلط فیصلوں کا پورا پورا علم ہے ہم تمام حاکموں کے حاکم ہیں۔ آج کے دن صرف ہماری حکومت ہے۔ قیامت کے دن میاں ارشاد فرمائیں گے لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ آج کے دن کس کی سلطنت ہے؟ پھراس سوال کا خود ہی جواب ارشاد فرمائیں گے لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّارِ آج کے دن صرف اللہ واحد قہار کی سلطنت ہے۔ سلاطینِ دنیا آج ایک سوت اورایک کوڑی کے دانت کے بھی مالک نہ ہوں گے۔ آج کے دن ہم اپنے مظلومین کی فریاد سنیں گے حتیٰ کہ کسی جانور نے اگر کسی جانور کوایک مرتبہ سینگ ماراتھا تو حق تعالیٰ ظالم اورمظلوم دونوں کو زندہ فرماکر حکم فرمائیں گے کہ اے مظلوم جانور تو بھی اس

ظالم کو ایک سینگ مار کر اپنا بدلہ لے تا کہ تیرے پروردگار کی صفت عدل کا پورا پورا ظہور ہو جاوے۔ اسی کو حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں ۔

عالمِ اوّل برائے امتحان
عالمِ ثانی جزائے ایں و آں

عالمِ دنیا کو حق تعالیٰ نے امتحان کے لیے پیدا فرمایا ہے اور عالمِ آخرت کو جزا و سزا کے لیے پیدا فرمایا ہے ۔

روزِ محشر ہر نہاں پیدا شود
ہم ز خود ہر مجرمے رسوا شود

قیامت کے دن ہر پوشیدہ بات ظاہر ہو جاوے گی اور ہر مجرم خود بخود اپنے ہی اعضاء کی شہادت سے رسوا ہو جاوے گا ۔

دست و پا بدہد گواہی بابیان
بر فسادِ خود بہ پیش مستعان

حق تعالیٰ کے سامنے قیامت کے دن ہاتھ پاؤں سب اپنے اپنے گناہوں پر گواہی دیں گے ۔

دست گوید من چنیں دزدیدہ ام
لب بگوید من چنیں بوسیدہ ام

ہاتھ کہے گا کہ میں نے اس طرح سے چوری کی ہے اور ہونٹ کہے گا کہ میں نے غیر محرم کا اس طرح بوسہ لیا ہے ۔

پا بگوید من شدستم تا مُنیٰ
فرج گوید من بکردستم زنا

پاؤں کہے گا کہ میں خواہشاتِ نفسانیہ کے مواقع تک چل کر پہنچا ہوں اور شرمگاہ گواہی دے گی کہ میں نے زنا کیا ہے ۔

چشم گوید کردہ ام غمزہ حرام
گوش گوید چیدہ ام سوء الکلام

آنکھیں گواہی دیں گی کہ ہم نے عورتوں پر حرام نگاہیں ڈالی ہیں اور کان گواہی دیں گے کہ ہم نے غیبت اور گانے وغیرہ سنے ہیں۔

گر تو می خواہی سلامت از ضرر
چشم از اوّل بند و پایاں نگر

قیامت کے اس دردناک منظر کو بیان کرنے کے بعد حضرت رومی رحمۃ اللہ علیہ نصیحت فرماتے ہیں کہ اے انسان اگر تو قیامت کے دن کی رسوائی سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے تو اپنی آنکھیں برے کاموں سے بند کر لے اور ہر کام کے شروع میں اس کے انجام پر خوب غور کر لے۔

توبہ کن مردانہ سر آور برہ
کہ فمن یعمل بمثقال یرہ

اپنے جرائم سے توبہ کر لے اور مردانہ راہ حق میں قدم رکھ کیونکہ خیر وشر کا ہر ذرہ کل قیامت کے دن تو اپنے سامنے موجود دیکھے گا۔

گر سیہ کردی تو نامہ عمر خویش
توبہ کن زانہا کہ کردستی تو پیش

اگر تو نے اپنے نامۂ عمر کو گناہوں سے سیاہ کر ڈالا تو اپنے پیش کردہ اعمال بد سے جلد توبہ کر لے۔

جملہ مافیہا ازو نیکو شوند
زہر پارینہ ازیں گردد چو قند

سچی توبہ کی برکت سے تمام ماضی کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں زہر پارینہ توبہ کی برکت سے مثلِ قند ہو جاتا ہے۔

ہیں بہ پشت آن مکن جرم و گناہ
کہ کنم توبہ در آیم در پناہ

توبہ کی خاصیت بیان فرمانے کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ مگر خوب سمجھ لو کہ توبہ کے سہارے پر جرم اور گناہ کرنے کے لیے جری مت ہونا کہ چلو جی اس وقت گناہ کرلو پھر توبہ کر کے پناہ حاصل کر لینا۔

زانکہ استغفار ہم در دست نیست
ذوق توبہ نقل ہر سرمست نیست

اس واسطے کہ توبہ و استغفار کرنا بھی ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے توبہ کا ذوق ہر سرمست کی غذا نہیں ہے یعنی ایسا نہ ہو کہ توبہ کے بھروسے پر گناہ کر بیٹھیں اور اس گناہ کی نحوست سے توبہ کی توفیق بھی سلب ہو جاوے۔

نقض توبہ عہد آن اصحاب سبت
موجب مسخ آمدو اہلاک ہست

اصحابِ سبت نے جب عہدِ توبہ کو توڑ ڈالا تو یہ فعلِ نقضِ توبہ کا ان کی مسخِ صورت اور ہلاکت کا سبب بن گیا چنانچہ یہ لوگ حکم قہری تکوینی سے بندر ہو گئے اور کچھ ہی دن میں سب مر گئے۔

اندریں امت نہ بد مسخ بدن
لیک مسخ دل بود اے بوالفطن

اس امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسخِ صورت کا عذاب رحمۃ اللعالمین کے صدقے میں اٹھالیا گیا لیکن کثرت نافرمانیوں اور نقضِ توبہ کے وبال سے دل کے مسخ ہو جانے کا عذاب اس امت پر بھی جاری ہے یعنی صورت تو مسخ نہیں ہوتی لیکن سیرت مسخ ہو جاتی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ استعداد صلاحیت و ہدایت وتقویٰ کا بالکلیہ فقدان ہو کر اس شخص کی سعادت مبدل بشقاوت ہو جاتی

ہے اوراس مسخِ باطن کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ توفیقِ اعمالِ صالحہ اور ذوقِ سلیم باقی نہیں رہتا اور اعمالِ خبیثہ ہی اس کے مرغوباتِ طبعیہ بن جاتے ہیں حق تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو اس عذاب مسخ باطن سے اور اس کے اسباب سے محفوظ فرمائیں، آمین۔

تقریر اثباتِ قیامت بعنوانِ ثانی

دوسرا عنوان اثبات قیامت کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے سوا تمام مخلوقات کا وجود ممکن ہے۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ ممکنات پر انقطاع وانتہا کا وقوع عقلاً واجب ہے پس عقلاً یہ بات ضروری ہونا ثابت ہوگئی کہ تخلیقِ کائنات کا یہ سلسلہ ایک دن ختم ہو جاوے ورنہ ممکنات کا غیر متناہی ہونا لازم آوے گا جو عقلاً محال ہے پس کائنات کے اسی منتہا کا نام قیامت ہے اور اس کا نام یوم میقات بھی ہے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ کَانَ مِیْقَاتًا﴾

(سورۃُ النبآء، آیت:١٧)

ترجمہ: بے شک فیصلے کا دن مقرر ہو چکا ہے۔

تقریر اثباتِ قیامت بعنوانِ ثالث

تیسرا عنوان اثبات قیامت کا یہ ہے کہ جب انسان نیند سے بیدار ہوتا ہے تو اس کو کچھ خبر نہیں ہوتی کہ ہم کتنی دیر تک سوتے رہے چنانچہ دوسروں سے دریافت کرتا ہے کہ کتنی دیر تک ہم پر نیند طاری رہی۔ اسی کو حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

شب ز زنداں بے خبر زندانیاں
شب ز دولت بے خبر سلطانیاں

رات کو نیند کی حالت میں ایک قیدی کو اپنے قیدی ہونے کا احساس غم اور ایک

سلطان وقت کو اپنی شاہی شوکت وراحت کا احساس باقی نہیں رہتا۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے نیند کو سببِ آرام فرمایا ہے:

﴿وَ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا﴾

(سورۃُ النبآء، آیت: ۹)

اور ہم نے نیند کو آرام کا سبب بنایا یہ قرآن کی بلاغت ہے کہ سبب آرام فرمایا ہے عینِ راحت نہیں فرمایا کیونکہ سونے کی حالت میں تو راحت یا رنج کسی بات کا ادراک نہیں ہوتا البتہ جب آدمی اچھی نیند سے سو کر اٹھتا ہے اس وقت اپنے جسم میں ایک خاص قسم کی فرحت اور تازگی محسوس کرتا ہے اور سونے سے قبل تھکاوٹ کے جو آثار محسوس ہو رہے تھے وہ سب ختم ہو جاتے ہیں۔ اس آیت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ نیند خود آرام سے نہیں بلکہ سببِ آرام ہے حدیث شریف میں آیا ہے کہ نیند موت کا بھائی ہے:

﴿اَلنَّوْمُ اَخُ الْمَوْتِ﴾

(البعث والنشور للبیهقی)

پس ہمارے سونے اور جاگنے میں قیامت کا نمونہ حق تعالیٰ نے رکھ دیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سو کر اٹھنے کی دعا میں اسی نمونۂ قیامت کا ذکر فرمایا ہے فرماتے ہیں:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَحْیَانَا بَعْدَ مَآ اَمَاتَنَا وَ اِلَیْهِ النُّشُوْرُ﴾

(صحیحُ البخاری، کتابُ الدعوات، باب ما یقول اذا اصبح، ج: ۲، ص: ۹۳۶)

تمام تعریفیں لائق ہیں اللہ تعالیٰ کے لیے جس نے ہم کو مرنے کے بعد زندہ فرمایا اور ہم کو اسی ذاتِ پاک کی طرف اٹھنا ہے اس دعا سے جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے علمی عمق کا پتہ چلتا ہے۔

اس عنوانِ ثالث کا مأخذ دراصل قرآنِ کریم کی ایک آیت ہے جس کو حق تعالیٰ شانہٗ نے سورۂ روم، پارہ: ۲۱ میں ارشاد فرمایا ہے فرماتے ہیں:

﴿وَمِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ﴾

(سورۃ الروم، آیت: ۲۳)

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اور اسی کی قدرت کی نشانیوں میں سے تمہارا سونا لیٹنا ہے رات میں اور دن میں گو رات کو زیادہ اور دن کو کم ہو اور اس کی روزی کو تمہارا تلاش کرنا ہے دن کو زیادہ اور رات کو کم اسی لیے دوسری آیات میں تخصیص واقع ہوئی ہے۔ اس امر مذکور میں بھی ان لوگوں کے لیے قدرت کی نشانیاں ہیں جو دلیل کو توجہ سے سنتے ہیں۔ (بیان القرآن)

اس آیتِ مذکورہ سے ہمارے مرشد پاک حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے دو مسائل تصوف کا استخراج فرمایا ہے جو درج ذیل ہے وَمِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ الخ اس سے معلوم ہوا کہ استراحت کے لیے سونا اور اسی طرح اسباب معاش کا حاصل کرنا یہ منافی کمال نہیں کیونکہ موقع منت میں ذکر فرمایا ہے تو ایسی چیز منافی کمال کیسے ہوگی البتہ ان میں انہماک ممنوع ہے۔ (ترجمہ مسائل السلوک)

خلاصہ یہ کہ ہر روز کا ہمارا سونا اور بیدار ہونا یہ کارخانہ خود اثباتِ قیامت کی ایک بڑی دلیل اپنے اندر رکھتا ہے ونعم ما قال العارف الرومی رحمۃ اللہ علیہ ؎

ہست ما را خواب و بیداری ما
بر نشان مرگ و محشر دو گوا

مولانا فرماتے ہیں کہ ہمارا ہر روز کا یہ خواب یعنی سو جانا اور پھر نیند سے بیدار ہو جانا یہ دونوں باتیں ہماری موت پر اور موت کے بعد دوبارہ اٹھنے پر گواہ ہیں۔

تقریرِ اثباتِ قیامت بعنوانِ رابع

اس عنوانِ رابع کا ماٌخذ آیتِ کریمہ:

﴿وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝﴾

(سورۃ القیامۃ، آیات: ۲۲-۲۳)

اس استدلال کو سمجھنے کے لیے پہلے ایک تمہید بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ ایک فاقہ زدہ غریب محتاج انسان غلبۂ تکلیف بھوک اور پیاس سے رورہا ہے اور کپڑوں کے بغیر سردی سے کانپ رہا ہے ایک رئیس کریم النفس انسان کو اس مضطر اور پریشان حال کی پریشانی کا علم ہوتا ہے اور وہ اپنے ملازمین کو حکم کرتا ہے کہ جاؤ اور اس شخص کو عمدہ کھانا کھلاؤ اور گرم کپڑے پہناؤ اور میرے کسی محل میں اس کو ٹھہراؤ اور اس سے کہہ دو کہ تم اس محل کے امیر کے مہمان ہو اب تم کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی ہر قسم کی راحت کا سامان موجود ہے جب تک تمہاری زندگی ہے تم اسی عیش و راحت میں رہ سکتے ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مفلس اور قلاش کے قلب پر امیر کے ان احسانات کا کیا اثر ہوگا۔ ہر بُنِ مو سے اس کا شکر گذار ہوگا اور اگر اس شخص کے اندر فطرتِ سلیمہ اور اس کے سینے میں قلبِ سلیم موجود ہے تو بتقاضاءِ فطرت یہ شخص اپنے اس محسن امیر کے دیدار اور زیارت کا مشتاق ہوگا اور ملازمین سے درخواست کرے گا کہ بھائی آپ لوگوں سے بصد شوق واضطرار میری ایک عرض یہ ہے کہ جس محسن امیر کا یہ محل ہے اور جس کے انعامات کو رات دن برت رہا ہوں اس کی ملاقات بھی کرادو میرا ایسا محسن اور میرا ایسا محبوب کہاں رہتا ہے؟ اپنے محسن کے دیدار اور ملاقات کا تقاضا پیدا ہونا عین اقتضاءِ فطرت ہے۔

جب ایک انسان کے احسان سے یہ اثر پیدا ہوتا ہے تو پھر جس ذات نے پیدا فرمایا ہے جو حقیقی مالک اور محسن ہیں ان کے احسانات کا کیا اثر ہوگا۔

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند
صاف گر باشد ندانم چوں کند

جس ذات پاک نے پیدا فرمایا اور ہر وقت طرح طرح کے احسانات اور انعامات سے نوازتے رہتے ہیں مخلوقات کا کوئی لمحہ اور کوئی سانس جس کی نعمت

اوراحسان سے خالی نہیں ہے ان کی محبت کا اوران کی ملاقات کا شوق کس درجہ ہوگا ظاہر ہے اس فطری خواہش کی تکمیل کے لیے حق تعالیٰ نے جنت میں اپنی ملاقات اوردیدار کا وعدہ فرمایا ہے۔ارشادفرماتے ہیں:

﴿وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝﴾

(سورۃ القیامۃ، آیات:۲۳-۲۲)

بہت سے چہرے تو اس روز بارونق ہوں گے اور وہ لوگ اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں۔اگرکوئی کہے کہ دنیا میں اس خواہش کی تکمیل کا وعدہ کیوں نہیں فرمایا تو جواب یہ ہے کہ مادیات کے اندر تجلیات کا تحمل نہیں۔ دنیا میں ایمان اور اعمالِ صالحہ کے انوار سے آنکھیں بنائی جارہی ہیں اور قیامت کے دن یہ آنکھیں کھول دی جائیں گی پس قیامت کا دن اگرحق تعالیٰ نے مقرر نہ فرمادیا ہوتا تو صالحین بندے ان کے دیدار سے اپنی فطری خواہش کی تکمیل کیسے کرسکتے۔

دنیا میں اس خواہش کی تسکین کے لیے حق تعالیٰ نے اپنا گھر بنادیا ہے تاکہ غلبۂ شوق میں ہمارے بندے کہیں اپنی جانیں نہ تلف کردیں اس لیے کہ ہم کو نہیں دیکھ سکتے تو ہمارے گھر کا طواف ہی کرکے تسلی حاصل کرلیں۔ریاض خیرآبادی نے خوب کہا ہے ؎

کعبہ سنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاض
زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا

بعض حاجیوں کو تو صرف بیت اللہ کی زیارت نصیب ہوتی ہے اور بعض حاجیوں کو جو عارفین اور عاشقین ہوتے ہیں ان کو اسی گھر میں کچھ اور بھی نظر آتا ہے۔ حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ اولیاء اللہ کے متعلق فرماتے ہیں ؎

حج زیارت کردنِ خانہ بود
حج رب البیت مردانہ بود

عام لوگوں کا حج خانہ کعبہ کی زیارت سے ہے اور خاص مقبولین بندوں کا حج صاحبِ خانہ کی زیارت سے ہے یعنی دل کی آنکھوں سے رب البیت کی زیارت کرنے والے اللہ والے ہوتے ہیں اللہ والوں کے دل میں تجلّیِ ربّ کا ظہور ہوتا ہے یعنی نورانیت کا ظہور ہوتا ہے۔

کعبہ را ہر دم تجلّی می فزود
کیں ز اخلاصات ابراہیم بود

جنت میں اگر میاں کا دیدار نہ ہوتا تو عاشقین پر تمام نعمتیں تلخ ہوجاتیں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

نہ دیکھا یار کو گھر بار کو دیکھا تو کیا دیکھا

پورا شعر یہ ہے۔

اگرچہ کوچۂ جاناں میں آ آ کر کے سر مارا
نہ دیکھا یار کو گھر بار کو دیکھا تو کیا دیکھا

عاشقینِ صادقین کا مذاق یہ ہوتا ہے۔

پھر حسرتِ پیکانِ نگہہ اے دل ناداں
اب تک تو ٹپکتا ہے لہو دیدۂ تر سے
آسی اسی حسرت میں مرے اور جیۓ ہم
بے پردہ نظارہ ہو کہیں دیدۂ سر سے

اور ہمارے حضرت خواجہ صاحب مجذوب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

نہیں کرتے ہیں وعدہ دید کا وہ حشر سے پہلے
دلِ بے تاب کی ضد ہے ابھی ہوتی یہیں ہوتی

قیامت کا دن اس لیے مقرر ہوا ہے تاکہ اپنے محسن اور منعم کا دیدار ہو ورنہ انسان کی یہ فطری خواہش کیسے اور کب پوری ہوگی تو ارشاد فرماتے ہیں وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ

نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَۃٌ فرماتے ہیں کہ ابھی دیکھا بھی نہیں ہے دیکھنے والے ہیں لیکن دیکھنے سے پہلے تازگی شروع ہوگئی اسی لئے ناضرہ کو مقدم فرمایا ہے عجیب علمی لطافت ہے۔

تقریر اثباتِ قیامت بعنوانِ خامس

پانچواں عنوان تقریرِ اثباتِ قیامت کا یہ ہے کہ قیامت تک جتنے انسانوں کو پیدا کرنے کا ارادہ علمِ الٰہی میں تجویز ہوا اتنے انسانوں کی پیدائش کے ذرات کو حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں بطور امانت ودیعت فرمادیا تھا (جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ بروزِ میثاق حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے تمام ارواح کو نکال کر ان سے عہد لیا گیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟)

پھر یہ اجمالی ذرات مع اپنی کمیت اور کیفیت اصلابِ آباء اور بطونِ اُمہات سے یعنی باپوں کی پشتوں اور ماؤں کی شکموں سے بحکمِ الٰہی بحفاظت اسی امانت کے ساتھ منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں حتیٰ کہ ماں باپ کا لب ولہجہ اور آنکھیں، طرزِ گفتار اور طرفِ رفتار سبھی کچھ اولاد میں منتقل ہوجاتا ہے۔ اب غور یہ کرنا ہے کہ ہر انسان کا وہ ذرۂ آفرینش جو حضرت آدم علیہ السلام کی پشتِ مبارک میں ودیعت فرمایا گیا تھا اتنے اصلاب اور بطون میں منتقل ہونے کے باوجود کس ذاتِ پاک کی قدرتِ قاہرہ کی نگرانی میں تغیر اور تبدل سے محفوظ رہتا ہے۔ علمِ الٰہی میں جس انسان کا جو ذرۂ آفرینش متعین ہوکر حضرت آدم علیہ السلام کی پشتِ مبارک میں رکھا گیا تھا کیا مجال کہ اس ذرۂ تولید میں کسی دوسرے انسان کا ذرۂ تولید داخل ہوجاوے یا اس ذرہ سے کوئی مقدار نکل کر دوسرے انسان کی خمیر میں داخل ہوجاوے۔ حالانکہ اس قدر اصلاب اور بطون میں نسلاً بعد نسلٍ ان ذرات کے منتقل ہونے میں اس امرِ مذکور کا وقوع عقلاً بعید نہ تھا پس اگر ہر انسان اپنے

ذرۂ آفرینش کی حفاظت کو اپنے والدین سے لے کر حضرت آدم علیہ السلام تک نسلاً بعد نسلٍ عروجاً اور نزولاً دونوں سلسلوں سے غور کرے تو حق تعالیٰ شانہٗ کی قدرت کا کمال اس پر مخفی نہیں رہ سکتا اور اپنی اس خود بیتی دلیل سے قیامت کے وقوع پر استدلال کرسکتا ہے کہ جو ذاتِ پاک ایسی کامل القدرت ہے وہ مرنے کے بعد بھی ہمارے تمام ذرات کی حفاظت پر قادر ہے خواہ ہم ہوا میں اڑ جائیں یا پانی میں مل جائیں کیونکہ ہم جو کچھ بھی ہو جائیں گے بہر صورت مخلوق ہی رہیں گے اور خالقِ کائنات کے علم اور قدرت کے اندر ہی رہیں گے:

﴿قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًاo اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ﴾

(سورۃ الاسرآء، آیات: ۵۱-۵۰)

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرمادیجئے کہ اے منکرینِ قیامت! تم خواہ پتھر یا لوہا یا اور کوئی مخلوق ہو کر دیکھ لو جو تمہارے ذہن میں بہت ہی بعید ہو اس پر یہ پوچھیں گے کہ وہ کون ہے جو ہم کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ آپ فرمادیجئے کہ وہ وہ ذات ہے جس نے تم کو اوّل بار پیدا کیا تھا یعنی تم اپنی پہلی پیدائش ہی میں قیامت کی دلیل لیے ہوئے ہو۔

تقریرِ اثباتِ قیامت بعنوانِ سادس

اثباتِ قیامت کی یہ تقریر حق تعالیٰ شانہٗ نے حضرت مرشد پاک تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے صدقے میں عجیب وغریب میرے دل میں القاء فرمائی ہے اور یہ تقریر بھی دراصل قرآن حکیم ہی کی ایک آیت کی تفصیل ہے۔ بات تو انہیں کی بات ہے ہم کیا ہیں اور ہماری بات ہی کیا ہے ؎

مائیم از تست توفیق اے خدا

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿ اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُّطْفَةٍ ﴾

(سورۂ یٰسین، آیت:۷۷)

کیا آدمی کو یہ نہیں معلوم کہ ہم نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا ہے۔ اسی سوال میں میاں نے علمِ عظیم سمو دیا ہے اب انسان اسی سوال میں غور کر کے اپنے خالق کو پہچان لے اور قیامت کے دن پر جو اشکال تھا اس کو حل کر لے۔ یہ کلام اللہ کا اعجاز ہے، یہ حکمتِ بالغہ ہے۔ قرآن اور حدیث میں سب کچھ موجود ہے مگر جس بندے پر میاں چاہتے ہیں اپنے علوم کھول دیتے ہیں، جب وہ چاہتے ہیں تو پردہ ہٹا دیتے ہیں اور جب پردہ ہٹ جاتا ہے تو ایک ہی آیت میں انسان ڈوب جاتا ہے، اسی جگہ مست ہو کر رہ جاتا ہے، اسی ایک آیت کی لذت اس کو آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ یہی تو بات تھی کہ جناب سیدنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پوری رات سجدے کی حالت میں صرف ایک آیت تلاوت فرماتے رہے اس آیت کی لذت نے وہیں روک لیا:

﴿ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ
فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴾

(سورۃ المائدۃ، آیت:۱۱۸)

اور اگر آپ عذاب دیں ان لوگوں کو تو یہ آپ کے بندے ہیں اور مالک اپنے ملک کا اور مملوک کا مختار ہے جو چاہے سو تصرف کرے اور اگر آپ بخش دیں ان لوگوں کو تو بے شک آپ عزیز الحکیم ہیں۔

ظاہر ہے کہ رحمۃ للعالمین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر اس آیت کا کیا اثر ہوا ہوگا اور پھر حق تعالیٰ شانہٗ سے عرض و معروض اور مناجات کا معاملہ تھا۔

سجدہ مچلا تھا جبیں ناز میں تھی

نعرۂ مستانہ خوش می آیدم
تا ابد جاناں چنیں می بایدم
(رومی)

حق تعالیٰ شانہٗ کی اس نعمت کا میں شکر گذار ہوں کہ اس آیت کی عجیب وغریب ایک تفصیلی تقریر میرے دل میں وارد فرمائی ہے اور اس تفصیل کے پیشِ نظر قیامت کا وقوع اس قدر بدیہی ہو جاتا ہے کہ کوئی دھریہ اور ملحد ان شاء اللہ تعالیٰ اس تقریر کو سن کر انکار کی گنجائش نہیں پا سکتا اور یہ حق تعالیٰ شانہٗ ہی کی طرف سے انعامِ عظیم ہے۔ وہ تقریر یہ ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ﴾

(سورۂ یٰسین، آیت:۷۷)

کیا آدمی کو یہ نہیں معلوم کہ ہم نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا ہے۔ اس سوال ہی کے اندر حق تعالیٰ شانہٗ نے دوبارہ پیدائش اور اثباتِ قیامت کا نقشہ کھڑا کر دیا ہے۔ یعنی میاں نے اس سوال سے یہ بتا دیا کہ اے انسان تیرا یہی نشرِ اوّل ترے نشرِ ثانی کے لیے نمونہ اور دلیل ہے جسے ہر وقت تو اپنے اندر دیکھ رہا ہے۔ اس آیتِ کریمہ کا شانِ نزول یہ ہے کہ ایک مشرک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک بوسیدہ ہڈی لے کر آیا اور اس ہڈی کو خاک میں ملا کر ہوا میں اڑا کر کہنے لگا کہ کیا اسی کو خدا دوبارہ پیدا کرے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں حق تعالیٰ تیری یہی حالت ہو جانے کے بعد تجھے دوبارہ پیدا فرما کر تجھے پھر جہنم میں دھکیل دے گا۔ اسی واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی کہ کیا انسان کو یہ نہیں معلوم کہ ہم نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا ہے۔ اس آیت کے اندر حق تعالیٰ شانہٗ نے منکرینِ قیامت کو ایسا جواب ارشاد فرمایا ہے جو ان کے روزمرہ مشاہدات میں ہے اور ہر ایک انسان پر خود بیتی حقیقت ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے اسی جواب کی تفصیل میرے قلب میں وارد فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی پہلی

پیدائش جب نطفہ سے ہوئی ہے اور یہ امر بالاتفاق تمام روئے زمین کے عقلاء کا مسلمہ ہے کسی کو بھی اس بات میں اختلاف نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ نطفہ کس چیز سے پیدا ہوتا ہے؟ اس نطفہ کے اجزاء کہاں کہاں تھے؟ اور کس کس رنگ و بو میں تھے؟ پھر حق تعالیٰ شانہٗ نے ان اجزاءِ منتشرہ کو کس طرح نطفہ میں جمع فرمایا؟ ان سوالات میں اب تفصیلی غور وفکر درکار ہے۔

ایک تفصیلی نظر

اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ اس منکرِ قیامت کو حق تعالیٰ شانہٗ نے جو یہ جواب دیا ہے کہ کیا انسان کو یہ نہیں معلوم کہ ہم نے اس کو نطفہ سے پیدا کیا ہے اس استدلال میں کس قدر علمِ عظیم ہے۔ میاں نے اسی مختصر سی آیت میں علم کا سمندر سمو دیا ہے یعنی حق تعالیٰ شانہٗ نے اس آیت سے یہ بتا دیا کہ اے نادان تو قیامت کا انکار اس لیے کرتا ہے کہ مرنے کے بعد جب یہ ہڈیاں بوسیدہ ہو جائیں گی تو خدا ان کو دوبارہ کیسے زندہ کرے گا تو نے اپنی قوت پر میری قدرت کو قیاس کیا تیری قوت بے شک اس امر سے عاجز ہے لیکن چراغ مردہ کا مقابلہ تو نے شمعِ آفتاب سے کیوں کیا تو میری قدرت کو اپنی قدرت پر کیونکر قیاس کرتا ہے پہلی پیدائش میں میری قدرت پر غور کرتا تو تجھے یہ استبعاد نہ ہوتا یعنی دوبارہ ان بوسیدہ ہڈیوں کا زندہ ہونا کچھ مشکل نہ معلوم ہوتا۔ پس اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ نے انسان کو اس کی پہلی پیدائش کی طرف غور وفکر کرنے کے لیے متوجہ فرما کر اس سے حشرِ ثانی کا یعنی وقوعِ قیامت کا استبعاد اور خلجان رفع فرما دیا۔ اور اس غور وفکر کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کو حق تعالیٰ شانہٗ نے نطفہ سے پیدا فرمایا اور نطفہ خون سے پیدا ہوتا ہے اور خون ان غذاؤں سے پیدا ہوتا ہے جو ماں باپ کے جسم میں بذریعہ خورد ونوش داخل ہوتی رہتی ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ غذائیں

مختلف مقامات سے ماں باپ تک پہنچتی ہیں۔ ہمارے مشاہدات اس امر پر شاہد ہیں کہ خشکی وتری کے مختلف راستوں سے ایک ملک کی غذائیں دوسرے ملک میں بھیجی جاتی ہیں پھر یہ غذائیں جب کھیتوں میں نشوونما پاتی ہیں تو ان کی پرورش میں آفتاب اور ماہتاب کی عروجی ونزولی رفتار سے ان کی مختلف درجۂ حرارت و برودت کی کیفیات بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ نیز شرقی، غربی، شمالی، جنوبی مختلف السمت اور مختلف الکیفیت ہواؤں کے جھونکے بھی پودوں پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی طرح ان پودوں میں مختلف چشموں اور نہروں کا جو پانی گذرتا ہے اس کے اندر زمین کے مختلف معدنیات کے اثرات بھی شامل ہو جاتے ہیں چنانچہ جس حصۂ زمین میں مثلاً گندھک کی کوئی کان ہوتی ہے اس حصے پر گذرنے والا پانی گندھک کی خاصیت اور کیفیت کو اپنے اندر لے لیتا ہے اور پودوں کی نشوونما میں اس کیفیت کو شامل کر دیتا ہے۔

اسی طرح ماں باپ جن مختلف جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں یا جن جانوروں کا دودھ نوش کرتے ہیں یہ حیوانات نہ جانے کتنے اقسام کی غذائیں چرتے رہتے ہیں اور ان کے اجسام میں نہ جانے کتنی انواع واقسام کے پھل پھول پہنچتے رہتے ہیں اسی طرح مچھلیوں کے کس قدر اقسام ہیں اور ہر قسم کی مچھلیوں کی علیحدہ علیحدہ غذائیں ہیں نیز ماں باپ علاجاً جو دوائیں استعمال کرتے ہیں وہ بھی مختلف ممالک سے آتی ہیں نیز بعض مرکب دواؤں میں سونے چاندی اور یاقوت وزمرد جیسے جواہرات بھی شامل رہتے ہیں اور بعض مرکبات میں فولاد کا جز شامل کیا جاتا ہے بعض میں حجریات شامل کیے جاتے ہیں بعض میں پارہ اور گندھک کا جز شامل کیا جاتا ہے اسی طرح ماں باپ کبھی شہد بھی استعمال کرتے ہیں اور شہد کے ذریعہ نہ جانے کہاں کہاں کے پھلوں اور پھولوں کے رس ماں باپ کے ابدان میں پہنچ جاتے ہیں۔ پھر انہیں مختلف ممالک کی

مختلف انواع واقسام کی غذاؤں سے خون بنتا ہے اور خون سے نطفہ بنتا ہے۔ پس اس تفصیل سے یہ امر واضح ہوگیا کہ انسان اپنی پہلی پیدائش سے پہلے سارے عالم میں منتشر تھا یعنی جس نطفہ سے انسان کو پیدا کیا جاتا ہے اس کے تمام ذرات باعتبار اپنی کمیات اور کیفیات کے سارے عالم میں منتشر ہوتے ہیں بعض اجزا نمک اور گندھک کی کانوں میں ہوتے ہیں بعض مختلف دریاؤں اور چشموں میں ہوتے ہیں بعض عرب کی کھجوروں میں ہوتے ہیں بعض آسٹریلیا کے گیہوں میں ہوتے ہیں بعض کشمیر اور قندھار کے پھلوں میں ہوتے ہیں بعض سمندر کی مچھلیوں میں ہوتے ہیں بعض مختلف کلیوں اور پھولوں میں ہوتے ہیں بعض سونے چاندی اور فولاد میں ہوتے ہیں یہ تو ان ذرّاتِ منی کی کمیات کا عالمِ انتشار تھا۔ اسی طرح ان ذرّاتِ منی کی کیفیات بھی پہلے منتشر ہوتی ہیں بعض آفتاب اور ماہتاب کی حار اور بارد شعاعوں میں ہوتی ہیں۔ بعض شرقی و غربی شمالی وجنوبی ہواؤں میں ہوتی ہیں بعض مختلف الکیفیت ادویہ اور اغذیہ میں ہوتی ہیں بعض رات اور دن کے یکے بعد دیگرے آنے جانے سے متعلق ہوتی ہیں بعض موسم سرما وگرما اور خزاں وبہار کے تغیرات سے متعلق ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر انسان کی پیدائش کے ذرات پہلے اقصاءِ عالم میں مختلف رنگ وکیف کے ساتھ منتشر ہوتے ہیں اور ہر ایک ذرّہ علمِ الٰہی میں حکمِ الٰہی کا منتظر اور دست بستہ حاضر ہوتا ہے دلیل یہ ہے کہ:

﴿الَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيْرُ﴾

(سورۃ الملک، آیت:۱۴)

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ بھلا وہی ذات نہ جانے جس نے پیدا کیا ہے وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيْرُ اور وہ باریک بین پورا باخبر ہے چنانچہ حکمِ الٰہی کے مطابق یہ تمام ذرّاتِ منتشرہ مع اپنی کیفیت وکمیت کے آفاقِ عالم سے ماں باپ

کے اجسام میں غذاءً یا دواءً یا ماکولاً یا مشروباً پہنچ جاتے ہیں اور حق تعالیٰ شانہٗ پھر اپنی قدرتِ قاہرہ سے ان ذرّاتِ غذائیہ سے خون بناتے ہیں اور والدین کے خون کے اندر دونوں قسم کے ذرات مشترک رہتے ہیں یعنی وہ ذرات جو ماں باپ کے جسم کی تربیت وحفاظت کرتے ہیں اور وہ ذرات جو آئندہ اولاد بننے والے ہیں پھر حق تعالیٰ اپنے حکمِ قہری تکوینی سے اولاد بننے والے ذرات کو خون سے الگ فرما کر نطفہ میں جمع فرما دیتے ہیں پھر اس نطفہ کو ماں تک پہنچانے کے لیے باپ کے اندر جنسی خواہش پیدا فرماتے ہیں۔ کیا رحمت ہے میاں کی کہ باپ کو اس امانت کو ماں تک پہنچانے میں مشقت اور تکلیف اٹھانے کے بجائے لذت کا بھی احساس ہوتا ہے پھر وہ ذرات منی ماں کے شکم میں پہنچ جاتے ہیں تو پھر اس پانی پر میاں تصویر کھینچتے ہیں اور نو ماہ کے بعد انہیں ذراتِ منتشرہ فی الآفاق کو بصورتِ انسان پیدا فرماتے ہیں ؎

دہد نطفہ را صورت چوں پری
کہ کرد ست بر آب صورت گری
از منی مردہ بت خوب آوری

مردہ منی سے زندہ انسان پیدا فرماتے ہیں اور پانی پر مصوری فرماتے ہیں پس انسان کی اس پہلی پیدائش میں خود قیامت کی دلیل حق تعالیٰ نے رکھ دی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب ہمارے منتشرہ ذرات کو حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ نے ماں کے شکم میں جمع فرما کر ایک دفعہ پیدا فرما دیا ہے تو اسی طرح دوسری بار پھر جب ہم سڑ گل جائیں گے اور منتشر ہو جائیں گے تو پھر حق تعالیٰ جمع فرما کر دوبارہ زندہ فرما دیں گے۔ ماں کے شکم میں کسی مخلوق کا گذر نہیں جب ماں باپ کا ہاتھ وہاں کام نہیں کر سکتا ہے تو بھلا کسی اور مخلوق کو کیا دخل ہو سکتا ہے۔ ماں کے پیٹ میں جس وقت آنکھیں کان ناک ہاتھ پاؤں بنائے جاتے ہیں تو ماں کو بھی خبر نہیں ہوتی

کہ میرے اندر کیا ہو رہا ہے دنیا کے اندر جس قدر تربیت کا تعلق مخلوق سے ہوتا ہے وہاں تکلیف ضرور ہوتی ہے مثلاً کپڑا سینا ہے تو درزی تھان پر قینچی ضرور چلادے گا پھر مشین کی سوئی اس پر چلادے گا۔ اسی طرح اگر چاقو بنانا ہے تو لوہے کو آگ میں تپاتے ہیں پھر گھنے پر گھنے مارتے ہیں اسی طرح روٹی پکانا جب مقصود ہوتا ہے تو پہلے گندم یا جو کو پیستے ہیں پھر پانی میں گوندھتے ہیں پھر آگ سے سینکتے ہیں حاصل یہ کہ دنیا میں تربیت کی جس قدر صورتیں ہیں سب کلفتوں اور صدہا مشقتوں کے ساتھ ہیں لیکن حق تعالیٰ شانہ کی جو ربوبیت بدون واسطہ خلق ہوتی ہے اس میں کلفت کا گذر نہیں ہوتا کیونکہ حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنی تعریف میں جہاں رب العالمین فرمایا ہے اس کے بعد ہی اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ فرما کر یہ بھی بتادیا کہ ہماری پرورش شانِ رحمانیت اور رحیمیت لئے ہوتی ہے اور اس کی دلیل تم خود اپنے اندر مشاہدہ کر چکے ہو جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بنائے جارہے تھے اس وقت تم پر کتنے گھنے لوہے کے پڑے تھے یا تمہیں آگ سے کتنی بار تپایا گیا تھا یا تمہارے اوپر کتنی مشینیں چلائی گئی تھیں کس شانِ رحمت سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور ماں کی پرورش کا تم انکار اس لیے نہیں کرتے ہو کہ خود تمہارے مشاہدات اس کی تربیت پر گواہ ہوتے ہیں اور باپ کی تصدیق ماں کی شہادت پر کرتے ہو تو معلوم ہوا کہ ربوبیت تمہارے نزدیک بھی نہایت محکم دلیل ہے پھر میری ربوبیت کو ہر وقت اپنی انہی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود کیونکر ایمان نہیں لاتے ہو وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یہ ایسے گدھے ہیں کہ اپنے رب کے منکر ہیں۔ یہاں کفر کا صفتِ رب کے ساتھ عجیب ربط ہے جن کے ذریعہ تربیت فرماتے ہیں ان کا انکار تو کر ہی نہیں سکتے دنیا میں کوئی ایسا احمق نہیں ہوا جس نے اپنی ماں کا انکار کیا ہو جب ماں کی تربیت میں یہ اثر ہے تو جس ذاتِ پاک نے ماؤں کو محبت کرنا اور پرورش کرنا سکھایا ہے جو اصلی مربی

ہیں ان کی تربیت کا کیسا کچھ اثر ہوگا۔

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند
صاف گر باشد ندانم چوں کند

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ اگر دنیا میں کوئی امر قابلِ تعجب دیکھنا آپ کو منظور ہو تو ان مشرکین نادانوں کا یہ قولِ انکارِ قیامت قابلِ تعجب ہے کیونکہ اپنی بیتی حقیقت کا علم رکھتے ہوئے اسی کا انکار بھی کر رہے ہیں۔ کفار یہ کہتے ہیں کہ:

﴿ءَ اِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ﴾
(سورۂ ق، آیت: ۳)

جب ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے تو کیا ہم دوبارہ زندہ ہوں گے یہ تو بہت ہی بعید بات ہے حق تعالیٰ شانہ ان کے اس استبعاد کا جواب ارشاد فرماتے ہیں:

﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِيْظٌ﴾
(سورۂ ق، آیت: ۴)

ہم ان کے اجزاء کو جانتے ہیں جن کو مٹی کم کرتی ہے یعنی مردوں کے جسم کو زمین جس طرح اور جس مقدار میں کم کرتی ہے اس مَا تَنْقُصُ کا ہمیں پورا پورا علم ہے اور ہمارے پاس کتاب محفوظ ہے اور تم کو اس پر تعجب کیوں ہے ہم تو تمہارے وساوس اور خیالات تک سے مطلع ہیں:

﴿وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ﴾
(سورۂ ق، آیت: ۱۶)

کمیات کے علم سے زیادہ اہم خیالات اور وساوس کا علم ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَقَالُوْٓا ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا﴾
(سورۂ الاسراء، آیت: ۴۹)

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور چورا ہو جائیں گے تو کیا ہم از سرِ نو پیدا اور زندہ کئے جاویں گے:

﴿قُلْ كُونُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا○ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِىْ صُدُوْرِكُمْ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا قُلِ الَّذِىْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ﴾

(سورۃ الاسرآء، آیات: ۵۱-۵۰)

آپ فرمادیجئے کہ تم پتھر یالوہایا کوئی اور مخلوق ہوکر دیکھ لو جو تمہارے ذہن میں بہت ہی بعید ہواس پر وہ پوچھیں گے کہ وہ کون ہے جو ہم کو دوبارہ زندہ کرے گا آپ فرمادیجئے کہ وہ وہ ذات ہے جس نے تم کو اوّل بار پیدا کیا ہے:

﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾

(سورۃ الواقعۃ، آیت: ۶۲)

تم اپنی پہلی پیدائش میں دلیلِ قیامت کا مشاہدہ کرنے کے باوجود پھر بے سمجھی کی باتیں کیوں کرتے ہو کوئی دہریہ کوئی مرتد کوئی ملعون اس حقیقت کا انکار نہیں کرسکتا کہ انسان نطفہ سے پیدا کیا جاتا ہے اور نطفہ خون سے بنتا ہے اور خون غذاؤں سے بنتا ہے اور یہ غذائیں تمام عالم میں منتشر ہوتی ہیں پس جب کہ انسان کی پہلی پیدائش کے وہ ذرات جو تمام عالم میں منتشر اور حیات سے بہت بعید تھے قدرتِ الٰہیہ سے جمع ہوکر ایک بار حیات کو قبول کر چکے ہیں تو مرنے کے بعد جب پھر وہ ذرات منتشر ہوجائیں گے تو پھر حق تعالیٰ شانہ کی قدرت سے ان ذرّاتِ منتشرہ کے دوبارہ جمع ہوکر زندہ ہوجانے میں کیا اعتراض اور تعجب ہوسکتا ہے جب کہ وہ ایک بار حیات قبول کر چکنے سے حیاتِ ثانوی کی صلاحیت اور استعداد بھی حاصل کر چکے ہیں۔ اسی کو حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں اے نادان انسان تو کہتا ہے کہ:

﴿قَالَ مَنْ يُّحْيِى الْعِظَامَ وَهِىَ رَمِيْمٌ﴾

(سورۃ یٰسین، آیت: ۷۸)

ہماری بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا تو فرماتے ہیں او بے ادب! چپ نالائق آموختہ بھول گیا اپنی پہلی پیدائش کا پچھلا سبق یاد کر:

﴿قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِىٓ اَنْشَأَهَا اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾

(سورۂ یٰسین، آیت: ۷۹)

جس نے تیرے اجزائے منتشرہ کو پہلی بار کی پیدائش میں اقصاءِ عالم سے کھینچ کھینچ کر ماں باپ تک پہنچادیا اور پھر ماں کے پیٹ میں کہ مشابہ ایک قبر خاکی کے ہے جمع فرما کر بعد نو ماہ تجھے احسنِ تقویم کے سانچے میں ڈھال کر زندہ پیدا کر دیا پس ایسی کامل القدرت ذات تجھ کو اسی طرح دوسری بار دوسری قبر سے زندہ اٹھا کر کھڑا کرے گی، ایک دفعہ ایک قبر سے یعنی ماں کے شکم سے پیدا ہونے کے بعد اب دوسری قبر سے پھر زندہ ہونا کچھ بھی مستبعد اور مشکل نہ رہا۔

تقریرِ اثباتِ قیامت بعنوانِ سادس: (منظوم)

بحکم حضرت مرشدی دامت برکاتہم عنوانِ سادس کو منظوم کر دیا گیا اور حضرت والا نے اس نظم کو بہت پسند فرمایا۔ (جامع)

قیامت کے منکر ذرا غور تو کر — کہ پیدا ہوا ہے تو دنیا میں کیونکر
ورق تو الٹ خلقِ اوّل کا ناداں — نہ خود پر گماں کر یہ ہے کارِ یزداں
ترا یہ وجود مجسم کہاں تھا — ترا مادّہ منتشر تھا نہاں تھا
جو کھاتے تھے ماں باپ شام وسحر میں — وہ پھیلے تھے ہند وعرب بحر و بر میں
غذاؤں پہ آثارِ شمس و قمر کے — ہواؤں کے جھونکے بھی شام وسحر کے
گذرتا تھا پودوں میں پانی جدھر سے — وہ مخلوط تھا معدنوں کے اثر سے
غرض سارے ذرّاتِ تولیدِ آدم — کہاں تھے یہ ماں باپ میں یوں منظّم
جو ذرہ ترا تھا نہاں جس غذا میں — غذائیں وہ حاضر تھیں علمِ خدا میں
وہ اقصائے عالم سے آئے سمٹ کر — نہیں جاسکا کوئی ذرہ بھی ہٹ کر
کھلایا انہیں تیرے ماں باپ کو جب — اکٹھے ہوئے تیرے ذرات بھی سب
بنایا اسے خون پھر اس سے نطفہ — ہوا بطنِ مادر میں جا کر وہ علقہ

پھر علقہ سے مضغہ پھر اس سے بنا کیا
بتاؤں میں صنعت گری اس کی کیا کیا
جو بخیے کئے اس نے اس آب وگل میں
سمجھ سے ہے باہر یقیں کر لے دل میں
غرض بطنِ مادر میں نو ماہ رہ کر
نکل آیا دنیا میں انسان بن کر
وہ جس نے کیا شکمِ مادر سے پیدا
ہے قادر کرے قبر سے پھر ہویدا
تری قبر پہلے جو تھی شکمِ مادر
وہ ہے قبر ثانی کی تشریح یکسر
ترا خلقِ اوّل تھا مشکل کہ ثانی
تو خود فیصلہ کر بایں راز دانی
تو خود ہے مجسم دلیلِ قیامت
اس انکار پر ہوگی تجھ کو ندامت
قیامت کا دن منتہائے عمل ہے
جزائے عمل ہے سزائے عمل ہے

ابطالِ مسئلہ آواگون

بعض گروہ کے نزدیک یہ مسئلہ ہے کہ برے لوگ مرنے کے بعد سانپ بچھو ہو جاتے ہیں اب اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر برے عمل پر سزا کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مجرم کو سزا کا احساس ہو اور وہ جرم سے باز آجائے اور صورتِ مذکورہ میں جب وہ سرکش انسان مرنے کے بعد سانپ اور بچھو بنا دیا گیا تو وہ اب سانپ اور بچھو بن کر اور جرائم کرنے لگے گا لوگوں کو ڈس ڈس کر خوب ایذاء پہنچائے گا۔ پھر دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ اب وہ سرکش اور بدعمل انسان جو پاداشِ عمل میں سانپ اور بچھو بنا دیا گیا اب وہ کون سا عمل کرے کہ اس کا دوسرا جنم بہتر ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ سانپ اور بچھو کون سا نیک عمل کر سکتے ہیں۔ ان دونوں اشکالات سے اس عقیدہ کا بطلان ظاہر ہے۔

صراطِ مُستقیم

(یعنی سیدھا راستہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ اَمَّا بَعۡدُ!
فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ، بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ۝ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ
غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ۝

ترجمہ و تفسیر از بیان القرآن: (اے اللہ) ہم کو سیدھا راستہ دکھلا دیجئے (**ف**: مراد دین کا راستہ ہے) ان لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے نہ راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو راستے سے گم ہو گئے۔ **ف**: راہِ ہدایت کے چھوڑنے کی دو وجہ ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ اس کی پوری تحقیقات نہ کرے، ضالین سے مراد ایسے لوگ ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ باوجود تحقیقات کے اس پر عمل نہ کرے مَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ سے مراد ایسے لوگ ہیں کیونکہ اچھی طرح جان بوجھ کر خلاف کرنے میں زیادہ ناراضی ہوا کرتی ہے۔ حق تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کے متعلق ایک عجیب مضمون وارد فرمایا ہے۔ حق تعالیٰ نے جب عالمِ ارواح سے روحوں کو اس آب و گل میں محبوس فرما کر یعنی انسانی قالب میں مقید کر کے ایک مدت عمر کے لیے عالمِ ناسوت یعنی دنیا میں بھیجا تو یہاں آ کر اسے بہت سے مشاغل اور علائقِ دنیویہ سے سابقہ پڑا جس کو یہ دیکھ کر گھبرا گئی اور عالمِ ارواح میں وہ ان تمام جھگڑوں سے فارغ تھی۔ لیکن اس عالمِ میں روح کی ترقی کی صورت نہ تھی کیونکہ عالمِ ارواح میں ارواح کا مقام ایسا ہی تھا جیسے کہ بیج گھر میں محفوظ رکھا ہوتا ہے لیکن اگر ان بیجوں کو گھر ہی میں رکھا رہنے دیا جائے تو ان بیجوں میں پھل پھول لگنے کی نوبت نہ آوے۔ اگر

ان بیجوں کی ترقی منظور ہے تو ان کو گھر سے نکال کر کھیت میں ڈال دیں، پھر ایک مدت خاص کے بعد دیکھو گے کہ ہر بیج اپنے خوشوں میں سیکڑوں دانے لیے ہوئے ہے۔ بیج کے اندر جس عظیم القامت درخت بننے کی صلاحیت موجود ہے اس کے ظہور کے لیے اس کا عالم دوسرا ہے یعنی اس کو مٹی میں دبا دیا جائے، پھر دیکھو گے کہ اسی ننھے بیج سے کتنا قد آور تنا کتنی شاخیں کتنے پھول پھل نکلتے ہیں۔ روح کے لیے یہ عالمِ آخرت کی کھیتی ہے۔ حق تعالیٰ نے دنیا کو حرثِ آخرت فرمایا ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ﴾

(سورۃ الشوریٰ، آیت: ٢٠)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کو کچھ دنیا دے دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔

روح کی یہ گھبراہٹ غلبۂ طبیعت کے سبب ہوئی کیونکہ عالمِ ارواح میں روح میں عناصرِ اربعہ یعنی خاک باد آب آتش کی طبیعتوں میں امتزاج نہ تھا۔ اس لیے وہاں سکون ہی سکون تھا۔ لیکن دنیا میں حق تعالیٰ نے اپنی قدرتِ قاہرہ سے ان مختلف اور متضاد طبیعتوں کے عناصر کو قالبِ انسانی میں جمع فرمادیا۔ قدرتِ قاہرہ کا ترجمہ قدرتِ غالبہ ہے، ہمارے مرشد پاک حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے قہر کا ترجمہ غلبۂ قدرت سے فرمایا ہے۔ روح کے اندر حق تعالیٰ نے ایسی خاصیت اور قوت رکھی ہے جو ان متضاد کیفیات کے عناصر کو ان کے مرکز اور مستقرِ طبعی کی طرف عود کرنے سے قسراً اور قہراً روکے رہتی ہے چنانچہ حکمِ الٰہی سے جب روح جسم سے نکل جاتی ہے تو پھر بمقتضاء اصل فطرت اور قاعدہ كُلُّ شَيْءٍ

يَرْجِعُ اِلٰی اَصْلِهٖ (ہر شے اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے) ہر عنصر جسم سے نکل کر اپنے طبعی مرکز کی طرف چل دیتا ہے۔ اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

ہندی و قپچاقی و رومی و حبش
جملہ یکرنگ اند اندر گور خوش

ہندی اور قپچاقی کہ ایک قوم ہے ترکوں کی اور رومی و حبشی یہ سب حالتِ زندگی میں مختلف رنگ اور مختلف شکل کے نظر آتے ہیں لیکن قبر میں جب ان کے عناصر تحلیل ہوجاتے ہیں تو پانی کرۂ آب کی طرف، ہوا کرۂ ہوا کی طرف، آگ کرۂ نار کی طرف، خاک کرۂ ارض کی طرف عود کرجاتی ہے اور چونکہ غالب جز ان عناصرِ اربعہ میں خاک ہی ہوتی ہے اس لیے قبروں میں پہنچ کر ہر ایک یکساں ہوجاتے ہیں یعنی سب کے سب صرف خاک کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ قبرستان کے اس منظر کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ اجسام جو چندروزہ حیاتِ دنیا کے ظاہری نقش ونگار پر فریفتہ تھے وہ سخت غفلت اور نادانی میں تھے۔ اسی کو ہمارے حضرت خواجہ صاحب مجذوب فرماتے ہیں ۔

رنگ رلیوں پہ زمانے کی نہ جانا اے دل
یہ خزاں ہے جو بانداز بہار آئی ہے

دنیا کی تکلیف اور راحت کی حقیقت سونے کی حالت میں سمجھنا چاہیے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ۔

شب ز زنداں بے خبر زندانیاں
شب ز دولت بے خبر سلطانیاں

حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ بڑے پیارے آدمی ہیں عجیب معرفت کی باتیں کہہ جاتے ہیں فرماتے ہیں کہ رات میں سونے کی حالت میں ایک وہ شخص

جو قید خانے میں ہے اور ایک وہ شخص جو صاحب سلطنت ہے دونوں برابر ہو جاتے ہیں نہ قیدی کو اپنے قید خانے کا غم یاد رہتا ہے نہ بادشاہ کو اپنی سلطنت اور شاہی شوکت کی خبر رہتی ہے۔

باقی رہنے والی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔بس جو کچھ ان کی عبادت اور بندگی میں اوقات گزرتے ہیں وہی اوقات اور لحاتِ زندگی کارآمد ہیں باقی دنیا کے تمام آرائش اور لہو ولعب کے کارخانے محض امتحان اور آزمائش کے لیے ہیں۔حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؎

زانکہ باقی صبغۃ اللہ است و بس
غیر آں بربستہ داں ہمچوں جرس

اس واسطے کہ باقی صرف اللہ ہی کا رنگ ہے اور مراد اس سے اعمال کا رنگ ہے اور اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف اعمالِ حسنہ کی شرافت ظاہر کرنے کے لیے ہے کیونکہ یہ اعمالِ حسنہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا کے اسباب ہیں اور اس میں اشارہ ہے حق تعالیٰ کے اس ارشادِ پاک کی طرف:

﴿صِبْغَةَ اللهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهُ عَابِدُوْنَ﴾
(سورۃ البقرۃ، آیت:۱۳۸)

ہم اس حالت پر رہیں گے جس میں اللہ تعالیٰ نے رنگ دیا ہے اور کون ہے جس کے رنگ دینے کی حالت اللہ تعالیٰ سے خوب تر ہو اور ہم اسی کی غلامی اختیار کئے ہوئے ہیں۔اور اللہ تعالیٰ کی طاعت اور بندگی کے علاوہ جو باتیں ہیں وہ سب غیر ہیں یعنی ان کا تعلق صرف ان اجسامِ فانیہ سے ہے روح کے نکلتے ہی ان علائق اور لذاتِ فانیہ کی جڑ کٹ جاتی ہے برعکس ان اعمالِ حسنہ کے جو روح کو منور کر دیتے ہیں یعنی انوارِ طاعت کا رنگ جو روح پر چڑھ جاتا ہے، اس کا زوال جسم کے فانی ہونے پر بھی نہیں ہوتا ہے۔چنانچہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے

ہیں کہ ؎

رنگ صدق و رنگ تقویٰ و یقیں
تا ابد باقی بود بر عابدیں

صدق اور تقویٰ اور یقین کا رنگ عابدین پر ابد تک باقی رہے گا۔ کبھی اس کو زوال نہیں ہوگا۔ آگے مولانا فرماتے ہیں کہ جس طرح اولیاء اللہ کے مجاہدات اور طاعات کے انوار کا اثر ان کی ارواح پر ہمیشہ باقی رہے گا اسی طرح نافرمانوں کی روحوں پر ان کے برے اعمال یعنی کفر و شرک اور نفاق کا جو رنگ ظلمت کا چڑھ جاتا ہے اس کو بھی فناءِ جسم کے بعد زوال نہ ہوگا جیسے نمرود مردود اور ابوجہل وغیرہ کی سیہ روئی۔ اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

رنگ شک و رنگ کفران و نفاق
تا ابد باقی بود برجانِ عاق

شک اور کفر و نفاق کا رنگ ابد تک نافرمان کی روح پر باقی رہے گا۔

روح کا علاقہ اس جسم کے ساتھ جس نوعیت کا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ہم کسی اور کے مملوک ہیں جب تک اس روح کا مالک چاہتا ہے اس وقت تک روح کو جسم کے اندر باقی رکھتا ہے اور جب اس مالک کا حاکم ہوجاتا ہے کہ اب تیری میعادِ عمر ختم ہو چکی اب تو میرے پاس لوٹ:

﴿اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ﴾
(سورۃ الفجر، آیت:۲۸)

ترجمہ: (اے روح اب) تو اپنے پروردگار کی طرف (واپس) چل۔

اس وقت تمام دنیا کے فلاسفہ اور سائنسدان عاجز اور حیران ہوجاتے ہیں کہ اہلِ سائنس خود بھی سائیں سائیں کرتے ہوئے موت کے شکار ہوجاتے ہیں، مردہ پڑا ہوا ہے آنکھیں کھلی ہیں لیکن اب دیکھتی نہیں ہیں مادی ترقیات کے

تمام عیش وراحت کے ذخیرے اب بے کار ہیں۔اسی کو جج اکبرالہ آبادی نے کہا ہے۔

قضاء کے سامنے بیکار ہوتے ہیں حواس اکبر
کھلی ہوتی ہیں گو آنکھیں مگر بینا نہیں ہوتیں

اور ہمارے خواجہ صاحب مجذوب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

جہاں دراصل ویرانہ ہے گو صورت ہے بستی کی
بس اتنی سی حقیقت ہے فریبِ خوابِ ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہوجائے

اس وقت مردہ بزبانِ حال یہی کہتا ہے کہ۔

جام تھا ساقی تھا مے تھی اور در میخانہ تھا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

دنیا میں آنے کے بعد ادھر تو روح کے لیے عزیز و اقارب اور پڑوسیوں کی موت اس امر کو مقتضی تھی کہ۔

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

دوسری طرف جسدِ عنصری کے تعلق کی وجہ سے نفسانی خواہشات یعنی غضب وشہوت کے تقاضے اپنے اندر محسوس ہوئے اور ان تقاضوں پر عمل کرنے کے صحیح اور غلط دونوں راستے سامنے نظر آئے مثلاً تقاضائے شہوت کی تکمیل کے لیے اپنی بیوی بھی سامنے ہے جو اس کا صحیح مصرف ہے اور غیر محرم عورتوں کا ہجوم بھی سامنے دیکھا جو اس کا غلط مصرف ہے۔

اسی طرح ہر خواہش کے سامنے پاکیزہ اور غیر پاکیزہ دونوں راستے دیکھ کر روح کو سخت پریشانی اور کشمکش کا سامنا ہوا کیونکہ نفس کا داعیہ شر کی طرف

جاذب تھا اور عقل کا داعیہ خیر کی طرف جاذب تھا اور عالمِ ارواح میں روح نے ایسی کش مکش کو نہ تو کبھی دیکھا تھا نہ کبھی سنا تھا۔ اسی طرح دنیا میں بہت سے تعلقات کے حقوق سر پر آ پڑے، اللہ تعالیٰ کے حقوق کا لحاظ الگ ہے، والدین کے حقوق کی الگ فکر ہے بیوی اور بچوں کے حقوق کی الگ فکر ہے، اپنے نفس اور پڑوسیوں کے حقوق الگ سامنے ہیں، دوست احباب کے حقوق الگ پیش نظر ہیں، پھر ان تمام حقوق میں تعارض اور تقابل کے وقت وجہ ترجیح اور وجہ تقدیم و تاخیر کو سمجھنا ایک مستقل مسئلہ سامنے ہے۔ عالم ارواح میں روح کو چونکہ ان مراحل سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا اس لیے روح کو ایک تو سب سے بڑا غم اپنے اصلی وطن یعنی عالمِ ارواح سے جدائی کا تھا ہی اس پر مزید افکار اور ہموم و غموم حقوق مذکورہ کے رکھ اٹھے۔ ایسی صورت میں روح نے بزبانِ حال حق تعالیٰ سے سوال کیا کہ اے میاں آپ نے ہمیں عالمِ ارواح سے اس عنصری قالب میں محبوس فرما کر ان جھگڑوں میں کیوں بھیج دیا۔ سوال کبھی زبان سے ہوتا ہے اور کبھی زبان تو چپ رہتی ہے لیکن اس کا حال اس کے سوال کی غمازی کرتا ہے۔ ہمارے خواجہ صاحب اسی کو فرماتے ہیں ؎

بے سوالی بھی نہ خالی جائے گی
دل کی بات آنکھوں سے پالی جائے گی

روح کا زبانِ حال سے یہ سوال کرنا عین اقتضاء فطرت ہے کیونکہ جو شے اپنے مرکز سے کٹ کر جدا ہوتی ہے اس کو اضطراب ہونا طبعی امر ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں کہ ؎

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش
باز جوید روزگار وصلِ خویش

مولانا فرماتے ہیں کہ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ جب کوئی شے اپنے اصل اور طبعی مرکز و

مستقر سے کسی قسری اور قہری قدرت سے جدا کردی جاتی ہے تو وہ شے پھر اپنے زمانۂ وصال کی متلاشی رہتی ہے جس طرح مچھلی اگر جبراً یا اتفاقاً پانی سے باہر آجاتی ہے تو وہ پھر پانی کی طرف عود کرنے کے لیے بے چین اور تڑپتی رہتی ہے۔اسی طرح روح چونکہ عالمِ ارواح سے جدا ہوئی ہے اس لیے پھر اسی باغ و بہار کی طالب ہے۔اب کوئی اعتراض کرسکتا ہے کہ کافر کی روح تو دنیا ہی کے بہار میں رہنا چاہتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر شے کی خاصیت کا ظہور عدمِ موانع سے مشروط ہوتا ہے پس کفار کی ارواح سے بسبب ان کے کفر اور طغیانی اور سرکشی کے ان کی طبعی اور فطری خاصیت بالکلیّہ باطل ہوجاتی ہے یعنی مسلسل نافرمانیوں کی ظلمتوں سے روح کا وہ نورانی مزاج جو عالمِ ارواح سے منتقل ہونے کے بعد اس میں موجود تھا وہ فاسد ہوکر اپنی فطری خاصیت کا فاقد (یعنی ضائع کرنے والا) ہوجاتا ہے جیسے پائخانہ سونگھتے سونگھتے بھنگی کی ناک کا مزاج بدل جاتا ہے چنانچہ مثنوی شریف میں ایک بھنگی کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ اتفاق سے کسی عطار کی دکان سے گذرا اور عطر کی خوشبو سونگھتے ہی وہ بے ہوش ہوگیا۔لوگوں نے اس پر گلاب چھڑکا اس کی بے ہوشی اور بڑھتی گئی اس کے بھائی کو جب خبر ہوئی تو وہ فوراً سمجھ گیا اور جلد ہی سے تھوڑا سا پائخانہ لاکر اس کی ناک پر رکھ دیا جب بدبو اس کے دماغ کو پہنچی تو فوراً اس کو ہوش آگیا اور اچھا ہوگیا تو معلوم ہوا کہ بدبو سونگھتے سونگھتے اس کی ناک اپنی اصل غذا یعنی خوشبو سے غیر مانوس اور متوحش ہوگئی تھی،اسی طرح کفارِ دنیا کی چندروزہ ظاہری زندگی کی فانی لذتوں میں مشغول ہوکر اور مسلسل نافرمانیوں میں غرق ہوکر اصل بہارِ آخرت سے غیر مانوس ہوگئے۔

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہ بازی

کرگس گِدھ کو کہتے ہیں جو مردار کھاتا ہے۔

اس کے برعکس اولیاء اللہ کی ارواح طاعات اور تقویٰ کے انوار سے اپنی فطری اور طبعی نورانی مزاج کی محافظ ہی نہیں ہوتیں بلکہ اپنی نورانیت میں ترقی کر کے ملائکہ سے بھی سبقت لے جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صالحین اور متقین بندے ہر وقت موت کے لیے متمنی رہتے ہیں، ان کا میلان ہر وقت عالمِ آخرت کی طرف رہتا ہے۔ حضرت رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

شد صفیر باز جاں در مرج دیں
نعرہائے لاَ اُحِبُّ الْآفِلِیْں

مولانا فرماتے ہیں کہ عارف باللہ روح کی آواز دنیا میں یہ ہوتی ہے کہ میں فنا ہونے والی چیزوں سے محبت نہیں کرتی۔ موت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

﴿اَلْمَوْتُ جِسْرٌ یُوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ﴾
(لباب الحدیث للسیوطی)

موت ایک پل ہے جو ایک دوست کو اپنے دوست سے ملانے والا ہے۔

اور اس کے برعکس جب یہودیوں نے کہا کہ ہم لوگ اولیاء اللہ ہیں تو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ۔

﴿قُلْ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَo وَلَا یَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَo﴾
(سورۃ الجمعۃ، آیات: ۶-۷)

ترجمہ: (اے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے کہ اے یہودیو! اگر تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تم بلا شرکتِ غیر اللہ تعالیٰ کے مقبول ہو تو اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کر دو اور وہ لوگ بوجہ ان اعمال کے جو اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں کبھی اس

کی (یعنی موت کی) تمنا نہ کریں گے اور اللہ کو ان ظالموں کی خوب اطلاع ہے۔

مشاہدہ ہے کہ نافرمانی سے ایک حجاب پیدا ہو جاتا ہے۔ دنیا میں اس کے نمونے موجود ہیں کہ جب کوئی غلام اپنے آقا کے ساتھ بغاوت اور سرکشی کرتا ہے تو پھر وہ آقا کے سامنے آنے سے خائف ہو جاتا ہے ہر وقت اس کو یہ فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ آقا کے ہاتھ میں اگر آگیا تو سیکڑوں جوتے سر پر برسیں گے۔ یہ خوف تو باغی اور سرکش کو ہوتا ہے اور کبھی فرماں بردار غلام سے بھی کوتاہیاں ہو جاتی ہیں اس صورت میں بھی غلام کو آقا سے حجاب ہوتا ہے لیکن اس خوف کی شان دوسری ہوتی ہے اس خوف میں عفو کی امید بھی شامل رہتی ہے۔ ایسا غلام آقا کے سامنے تو جاتا ہے لیکن غلبۂ ندامت سے اس پر سکوت کا عالم طاری رہتا ہے اور لطف اور راز و نیاز کی باتیں کچھ دن کے لیے ملتوی ہو جاتی ہیں یہی حال صدورِ معصیت کے بعد سالکین کا ہوتا ہے۔ ایک عربی شاعر کہتا ہے ؎

اُحِبُّ مُنَاجَاةَ الْحَبِیْبِ بِاَوْجِهٖ
وَلٰكِنَّ لِسَانَ الْمُذْنِبِیْنَ كَلِیْلٌ

ترجمہ: میں محبوب کے ساتھ سرگوشی کو بہت سے عنوانات سے محبوب رکھتا ہوں لیکن گنہگاروں کی زبان نافرمانیوں کے استحضار سے گونگی ہو جاتی ہے۔

یعنی کوتاہیوں کے بعد طاعات اور ذکر و مناجات میں ایک بستگی سی قلب میں محسوس ہونے لگتی ہے اور اتنے ہی سے سالکین پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ؎

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود
گر ز باغِ دل خلالے کم بود

مولانا فرماتے ہیں کہ سالک پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں جب اُن کو اپنے باغ دل میں ایک خلال کی بھی کمی نظر آتی ہے کیونکہ یہ خلال بھی بڑی مشقت سے

ہاتھ لگا تھا، مجاہدات کے دریائے خون سے گذرے تھے جب یہ انوار قلب میں پیدا ہوئے تھے۔

عارفاں زانند ہر دم آمنوں
کہ گذر کردند از دریائے خوں

مولانا فرماتے ہیں کہ عارفین ہر وقت امن اور چین میں اس سبب سے ہیں کہ انہوں نے رضائے حق کے لیے دریائے خون سے عبور کیا ہے یعنی نہ جانے کتنی کتنی مشقتیں نفسانی تقاضوں کو روکنے میں جھیلی ہیں اور استقامت علی الاعمال اور دوامِ ذکر کے لیے کیسی کیسی محنتیں کی ہیں۔

محرمِ ایں ہوش جز بے ہوش نیست
مرزباں را مشتری جز گوش نیست

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ہوش یعنی تعلق مع اللہ کا غلبہ کس کو نصیب ہوتا ہے جو اس عالم سے بے ہوش ہوجاتا ہے۔ اس بے ہوشی کا یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ وہ پاگل ہوجاتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تعلقاتِ ضروریہ کی حفاظت اور تعلقات غیر ضروریہ سے انقطاع اختیار کرتا ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيْلًا﴾
﴿سورۃُ المزمل، آیت:۸﴾

ترجمہ: (اے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اپنے رب کا نام یاد کرتے رہیے اور سب سے قطع کر کے اسی کی طرف متوجہ رہیے۔

حق تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر اسم رب کو مقدم فرما کر یہ بتا دیا کہ تمام علائق سے دل خالی کر کے ہماری طرف بالکل متوجہ رہنے کی توفیق جبھی ہوتی ہے جب ہمارا نام لیا جائے۔ غلبۂ ذکر سے تبتل کی قوت قلب میں پیدا ہوتی ہے

کیونکہ میں ذاکر بندے کا، ہمنشین اور جلیس ہوتا ہوں كَمَا هُوَ فِي الْحَدِيْثِ:

﴿اَنَا جَلِيْسُ مَنْ ذَكَرَنِیْ﴾

(شعبُ الایمان للبیہقی)

اور جب میں پاس ہوں گا تو میرے قرب کی نعمت تم کو میرے ماسوا سے بے پروا اور مستغنی کردے گی۔ پس جس قدر ذکر کامل نصیب ہوگا اسی قدر تبتل کامل نصیب ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا کو مطلقاً ترک کرے کسی پہاڑ کے غار میں جا بیٹھیں، اسلام نے تو رہبانیت کی اجازت ہی نہیں دی بلکہ مطلب یہ ہے کہ قلب میں تعلق مع اللہ کا غلبہ اس قدر رہے کہ غیر اللہ دل میں داخل نہ ہوسکے۔ اسی کو حضرت عارف رومی فرماتے ہیں ؎

آب در کشتی ہلاک کشتی است
آب اندر زیر کشتی پشتی است

کشتی کے اندر پانی کا داخل ہوجانا کشتی کی ہلاکت کا سبب ہے لیکن کشتی کے نیچے پانی کا رہنا اس کی پشتی ہے۔

اس شعر کے اندر مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک علمِ عظیم رکھ دیا ہے، حق تعالیٰ نے ان کو معرفت کا بڑا حصہ عطا فرمایا تھا۔ اس شعر کے اندر ترکِ دنیا کا طریقہ ارشاد فرمادیا یعنی سب سے قطع کرکے حق تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ دل میں تعلقات ماسوی اللہ داخل نہ ہونے پائیں یعنی بقدرِ ضرورت کسبِ معاش کے لیے اسباب میں مشغولی تبتل کے خلاف نہیں ہے۔ جس طرح کہ پانی اگر کشتی کے نیچے بھی نہ رہے تو کشتی چلے کیسے؟ لیکن اگر دنیا کے تعلقات دل میں داخل ہوگئے تو اس صورت میں قلب کی ہلاکت ہے کیونکہ قلب ایک نازک آبگینہ ہے جو صرف شہنشاہِ حقیقی کا مسکن ہے یہی وجہ ہے کہ دل کی غذا صرف ذکر اللہ ہے:

﴿اَلاَ بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾
(سورة الرعد، آیت:۲۸)

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں خوب غور سے سن لو کہ دلوں کو چین صرف میری یاد سے نصیب ہوتا ہے۔

اسی کو حضرتِ عارف رومیؒ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

آں زجاجے کو ندارد نورِ جاں
بول قارورہ است قندیلش مخواں

جو آبگینہ یعنی قلب اپنے اندر نورِ جان یعنی تعلق مع اللہ نہیں رکھتا ہے وہ دل نہیں ہے وہ محض قارورہ کی شیشی ہے جس میں مریض اپنا پیشاب حکیموں کے پاس لے جاتا ہے۔ دل کب دل ہوتا ہے جب اس کے اندر حق تعالیٰ کے ساتھ مستقل رابطہ قائم ہو جائے۔ اسی کو ایک بزرگ مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی فرماتے ہیں ۔

شکر ہے دردِ دل مستقل ہوگیا
اب تو شاید مرا دل بھی دل ہوگیا

اور ہمارے خواجہ صاحب مجذوبؒ فرماتے ہیں ۔

آئینہ بنتا ہے رگڑے لاکھ جب کھاتا ہے دل
کچھ نہ پوچھو دل بہت مشکل سے بن پاتا ہے دل

الغرض روح نے غلبۂ طبیعت کے سبب زبانِ حال سے اپنی جدائی کا غم بیان کیا تو حق تعالیٰ کی رحمت کو جوش ہوا۔ حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

ہر کجا دردے دوا آنجا رود
ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

ہر کجا پستی است آب آنجا رود
ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

جہاں درد ہوتا ہے وہیں اس کی دوا پہنچتی ہے، جہاں مرض ہوتا ہے وہیں اس کی شفا پہنچتی ہے، جہاں پستی ہوتی ہے اسی طرف پانی اپنا رخ کرتا ہے، جہاں مشکل ہوتی ہے وہیں اس کا جواب پہنچتا ہے ؎

تشنگاں گر آب جویند از جہاں
آب ہم جوید بہ عالم تشنگاں

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس طرح پیاسے جہاں میں پانی ڈھونڈتے ہیں اسی طرح پانی بھی اپنے پیاسوں کو ڈھونڈتا ہے۔

حاصل یہ کہ محبت طرفین سے ہوتی ہے **یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ** حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ ان لوگوں سے (یعنی حضرات صحابہ رضوانُ اللہ علیہم اجمعین سے) محبت کرتا ہے اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ **یُحِبُّھُمْ** کو مقدم فرما کر یہ بتا دیا کہ پہلے ہم تمہیں چاہتے ہیں پھر ہماری محبت کے فیض سے تمہارے دل ہمیں چاہنے لگتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

مری طلب بھی کسی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

اللہ تعالیٰ کے دریائے رحمت کو روح کی پریشانی اور غمِ ہجر پر جوش آیا اور روح کو اس بے کسی کے عالم میں لق و دق میدان میں نفس کے حوالے ہو جانے سے نجات کا راستہ نازل فرمایا جس کا نام صراطِ مستقیم ہے۔ صراطِ مستقیم کا ترجمہ سیدھا راستہ ہے، صراط مستقیم وہ راستہ ہے جس پر چل کر بندہ اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا مقرب بندہ بن جاتا ہے۔ صراط مستقیم پر چلنا یہی روح کے لیے دوائے ہجر ہے اور صراط مستقیم نازل فرمانے سے پہلے ایک درخواست بندوں کی

طرف نازل فرمائی کیونکہ بڑے دربار سے کوئی نعمت جب دی جاتی ہے تو کہا کرتے ہیں کہ درخواست لکھ کر لاؤ حالانکہ نعمت دینے کی منظوری ہو چکی ہوتی ہے۔ حضرت مرشدی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے دنیا کے یہ کارخانے عالم آخرت کے نمونے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کے شایانِ شان بندے درخواست نہیں پیش کر سکتے تھے حق تعالیٰ کی تعریف کے لیے حق تعالیٰ کی معرفتِ کاملہ اور تمام صفات کا احاطہ ضروری ہے اور بندوں کی عقل محدود کے لیے صفات غیر متناہیہ کا احاطہ عقلاً محال ہے۔ بندوں کی اس عاجزی اور مجبوری کا چونکہ حق تعالیٰ کو علم تھا اور کیونکران کو علم نہ ہوتا جبکہ وہ پیدا فرمانے والے ہیں، پس حق تعالیٰ کی رحمت بندوں کی طرف سے وکیل بن گئی اور فرمایا کہ ہم تمہارے مولیٰ بھی ہیں اور وکیل بھی ہیں۔ نعم الوکیل فرمایا ہے یعنی ہم تمہارے بڑے اچھے کارساز ہیں ہمارے حضرت مرشدی رحمۃ اللہ علیہ نے وکیل کا ترجمہ کارساز فرمایا ہے۔ اسی کو حضرت عارف فرماتے ہیں ؎

کار سازِ ما بفکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

حضرت فرماتے تھے کہ میں نے مصرعہ اولیٰ میں ترمیم کی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے فکر کا لفظ مناسب نہیں ہے۔ فکر مستلزم ہے تغیر کو اور ہر تغیر مستلزم ہے حدوث کو اور حدوث منافی ہے ذات واجب الوجود کے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ پر اس وقت محبت الٰہیہ کا حال غالب تھا اور مغلوب الحال معذور ہوتا ہے۔ میں نے اس میں یہ ترمیم کی ہے ؎

کار سازِ ما بسازِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

حق تعالیٰ نے وکالۃً بندوں کی طرف سے صراط مستقیم کی ہدایت کے

لیے درخواست نازل فرمائی جو سورۂ فاتحہ میں مذکور ہے۔ اسی درخواست کی منظوری میں تیس پارے کا قرآنِ پاک نازل فرمایا گیا۔

صراطِ مستقیم بتا کر حق تعالیٰ نے روح کو یہ بتادیا کہ عالمِ ارواح سے جدا کر کے عالم ناسوت یعنی دنیا میں تجھے بھیجنے کا مقصد تجھ کو اپنے سے دور کرنا نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ تجھے ہم اپنی ایسی معرفت عطا فرمادیں جس کی بدولت تو میری دوستی کے قابل ہو جاوے۔ اندھا اگر مقرب ہی ہو تو اس کو قرب کا لطفِ تام حاصل نہ ہوگا۔ دنیا میں تجھے بینا بنانے کے لیے بھیجا ہے یہاں تیری آنکھیں ایمان اور تقویٰ کے نور سے بنائی جاویں گی اور عالمِ آخرت میں یہی بنی ہوئی آنکھیں کھول دی جائیں گی۔ عالمِ ارواح میں تم صرف بندے اور غلام رہتے اور اس عالم میں بھیج کر ایمان بالغیب اور تقویٰ کی برکت سے ہم تمہیں اپنا دوست بنالیں گے۔ کیا یہ معمولی انعام ہے کہ آقا اپنے بندے اور غلام کو دوست بنالے۔ دنیا میں اپنے غلام کو کوئی بادشاہ دوست بنانا تو بڑی بات ہے زبان سے بھی غلام کو دوست کہنے میں اپنی توہین سمجھتے ہیں حالانکہ سلاطینِ دنیا بشریت میں تمہارے ہم جنس ہیں یعنی تم بھی انسان ہو اور یہ شاہانِ دنیا بھی انسان ہیں لیکن ان کی وضع داری ان کو اس امر سے مانع ہو جاتی ہے کہ اپنے غلام کو دوست کے لقب سے یاد کریں۔ مگر میری عطا اور میرے کرم بے مثال کو دیکھو کہ ہم تمہارے خالق بھی ہیں اور مالک بھی ہیں، تمہارے جسم کے ظاہر اور باطن کا ہر ذرہ ہمارا مملوک ہے، ہماری مخلوق ہے اور ہمارا پرورش کیا ہوا ہے، ہم نے تم کو عدم سے وجود بخشا ہے ہم نے تمہاری آنکھوں کو بینا بنایا ہے کانوں کو سننے والا بنایا ہے زبان کو گویائی بخشی ہے ناک میں سونگھنے کی قوت عطا فرمائی ہے دماغ میں عقل اور فہم کا خزانہ رکھا ہے۔ ہاتھ پاؤں ایسے جوڑ دار بنائے ہیں جن سے مختلف کاموں کے وقت مختلف طرز سے تم کام لیتے ہو اور تمہارا ہر ذرہ ہر وقت ہماری

قدرتِ قاہرہ اور قدرتِ غالبہ کے تحت ہے۔ فرماتے ہیں وَھُوَ الْقَاھِرُ فَوْقَ عِبَادِہٖ اور وہ ذات پاک ہے اپنے بندوں پر غالب القدرۃ ہے اتنی عظمت اور جلالتِ شانِ الوہیت کے باوجود ہم اپنے کرم سے تمہیں اپنا دوست بنا لیتے ہیں، ہم تمہارے ایسے مولیٰ ہیں جو تم غلاموں کو دوست بنا لینے والے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری تمام صفات میں ہماری ایک صفت ودود بھی ہے یعنی بہت محبت کرنے والا۔ پس ہماری شان محبت کا مقتضاء یہ ہے کہ ہم غلاموں کو دوست کے خطاب سے نواز دیتے ہیں ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں وَھُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ، وہ یعنی اللہ بہت بخشنے والا اور بہت محبت فرمانے والا ہے۔ میں اس کا ترجمہ بزبانِ محبت میں یہ کیا کرتا ہوں کہ میاں بندوں کو اس آیت سے اس بات کی خبر دے رہے ہیں کہ ہم تمہیں کیوں بخش دیتے ہیں جانتے ہو؟ پھر خود ہی فرماتے ہیں کہ زیادہ محبت کی وجہ سے، تمہاری مغفرت کا سبب ہماری محبت کا اقتضاء ہے۔ یہ عجیب ربط یہاں غفور اور ودود کا سمجھ میں آیا ہے۔ قرآن کے لطائف بھی عجیب ہیں۔

مخدرات سراپردہ ہائے قرآنی
چہ دلبرند کہ دل می برند پنہانی

ہماری محبت کا تقاضا تھا کہ ہم تمہیں عالمِ ارواح سے ایک مدت عمر کے لیے دنیا میں بھیج دیں تاکہ تمہاری عبدیت پر ہم اپنی ولایت یعنی دوستی کا تاج رکھ دیں۔ کیونکہ ہماری دوستی کے لیے دو شرطیں ہیں (۱) ایمان بالغیب اور (۲) تقویٰ۔ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اَلاَ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللہِ لاَ خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلاَ ھُمْ یَحْزَنُوْنَ○
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ○﴾
﴿سورۂ یونس، آیت: ۶۳-۶۲﴾

ترجمہ: یاد رکھو اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ناک واقعہ پڑنے والا ہے اور نہ وہ کسی مطلوب کے فوت ہونے پر مغموم ہوتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ ان کو خوفناک اور غمناک حوادث سے بچاتا ہے اور وہ اللہ کے دوست ہیں جو ایمان لائے اور معاصی سے پرہیز رکھتے ہیں یعنی ایمان اور تقویٰ سے اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے۔

ہمارے مرشدی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام پر فائدہ کے تحت تحریر فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے دوستوں سے جس خوف اور جس غم کی نفی فرمائی ہے اس خوف سے خوفِ حق اور غم سے غمِ آخرت مراد نہیں ہے بلکہ دنیوی خوف اور غم کی نفی مراد ہے جس کا احتمال دین کے مخالفین سے ایذاء رسانیوں سے ہوسکتا ہے وہ مومنین کاملین کو نہیں ہوتا کیونکہ ہر وقت ان کو اللہ تعالیٰ پر اعتماد ہوتا ہے، ہر واقعہ کی حکمت کا اعتقاد ہوتا ہے۔ (از تفسیر القرآن)

اس آیت میں یتقون کا صیغہ مضارع کا ہے جس کے اندر خاصیت تجددِ استمراری ہوتی ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اولیاء اللہ خوفِ حق سے اور غمِ آخرت سے ہر وقت ڈرتے رہتے ہیں۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس بات کا پتہ بتادیا ہے کہ ہماری ولایت یعنی دوستی کا شرف تم کو کب نصیب ہوگا؟ جب تم ان دو شرطوں کو پورا کر دکھاؤ گے اور وہ دو شرطیں کیا ہیں ایمان بالغیب اور تقویٰ۔

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿نَحنُ اَوْلِیَآءُ کُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ﴾

(سورۂ فصلت، آیت: ۳۱)

اور ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی رہیں گے۔

اس آیت میں ولایتِ حیاتِ دنیوی کی تقدیم سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ

کی رفاقت اور ولایت کے لیے دنیا کی حیات اوّل ظرف ہے یعنی اوّلاً دنیا میں ایمان بالغیب اور تقویٰ اختیار کر کے حق تعالیٰ کی ولایت یعنی دوستی سے بندہ مشرف ہوتا ہے پھر اسی عالمِ ناسوت کی یعنی دنیا کی دوستی آخرت میں بھی کام آتی ہے یعنی ولایت فی الآخرۃ دراصل ولایت فی الحیاۃ الدنیا ہی کا ثمرہ ہوتی ہے جو دنیا میں حق تعالیٰ کا ولی نہ ہوگا وہ آخرت میں بھی حق تعالیٰ کا ولی نہ ہوگا۔ ہمارے حضرت مرشدی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ نبوت کا دروازہ بند ہوا ہے ولایت کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ نبوت محض وہبی نعمت ہے اور ولایت کو بندوں کے اختیار میں دے دیا ہے کیونکہ ایمان اور تقویٰ دونوں اموراختیاریہ سے ہیں اور جوش میں فرمایا کہ اب بھی حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کی کرسی پر بیٹھنے والے لوگ موجود ہیں کرسیاں خالی نہیں ہیں سب پُر ہیں ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں است
خم و خمخانہ بامہر و نشان است

(اس وقت حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ پر ایک خاص حالت طاری ہوگئی تھی۔)

البتہ ایمان اور تقویٰ اگرچہ اموراختیاریہ سے ہیں لیکن ان کے اختیار کرنے میں مجاہدات اختیار کرنے پڑتے ہیں ایمان تو بفضلہٖ تعالیٰ ہم لوگوں کو حاصل ہی ہے صرف جزءِ ثانی یعنی تقویٰ کی تحصیل کے لیے کوشش اور مجاہدہ کرنا ہے۔ اسی مجاہدہ کے متعلق ہمارے خواجہ صاحب فرماتے ہیں ؎

برسائیں گے جب خونِ دل اور خونِ جگر ہم
دیکھیں گے تبھی نخلِ محبت میں ثمر ہم

تقویٰ کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی حق تعالیٰ نے ارشاد فرمادیا ہے۔ فرماتے ہیں:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾

(سورۃ التوبۃ، آیت: ۱۱۹)

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہا کرو۔ اس ترجمہ میں بھی خاصیت تجدد استمرار کی ملحوظ ہے کیونکہ امر کا صیغہ مضارع ہی سے بنتا ہے۔ اب سوال ہوتا ہے کہ کیسے ڈریں، ڈرنے کا طریقہ کیا ہے؟ تو خود ہی اس سوال کا جواب ارشاد فرماتے ہیں وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ کسی اللہ والے کی صحبت میں رہ پڑو چند دن کسی کامل کی صحبت میں رہ کر اس کے صدقِ اعمال اور صدقِ مقال کو دیکھا کرو کہ وہ اللہ والا کس طرح اللہ سے ڈرتا ہے، غصہ کی حالت میں وہ اللہ والا کس طرح غصہ کو حق تعالیٰ کے خوف سے پی جاتا ہے اور کس طرح وہ خدا کے دشمنوں پر غصے کو نافذ کرتا ہے، اسی طرح وہ حالت مصیبت میں کس طرح خدا کے خوف سے صراط مستقیم پر جمار ہتا ہے اس حالت میں اس کے صبر کی کیفیت دیکھو اسی طرح وہ نعمتوں کی حالت میں کس طرح خدا کا شکر گذار رہتا ہے اس حالت میں اس کا شکر دیکھو اور اس کی عبدیت دیکھو کہ وہ نعمتوں میں اترانے نہیں لگتا، ناز اور تکبر کی باتیں نہیں کرتا، نہ اپنی چال میں اینٹھ مروڑ کرتا ہے۔ اسی طرح وہ دوستوں کے ساتھ کس طرح خندہ پیشانی سے ملتا ہے اور دشمنوں کی ایذاء رسانیوں کو کس طرح برداشت کرتا ہے اور اس کا اپنے بڑوں کے ساتھ ادب دیکھو اور چھوٹوں کے ساتھ اس کی شفقت دیکھو، اس کی عبادت میں اس کا اخبات اور اس کی خشوع وخضوع کی کیفیت دیکھو، اس کی گفتگو اور اس کے لب ولہجے میں اس کی شانِ عبدیت دیکھو۔ اور اس پر خاتمہ کے خوف سے جو آثارِ حزن غالب رہتے ہیں اس کو دیکھو نیز خوفِ خاتمہ کے سبب اس کا اپنے کو تمام مخلوقات حتیٰ کہ سور اور کتوں سے بدتر سمجھنے کی حالتِ رفیعہ کو دیکھو۔ الغرض اس صادق القول اور صادق العمل یعنی بندۂ کامل کی ہر ہر حالت کو دیکھتے رہو اس دیکھنے کا تمہارے اوپر یہ اثر ہوگا کہ تمہاری طبیعتِ آخذہ خفیہ خفیہ اس مومنِ کامل کے تمام اخلاق و عاداتِ حسنہ اپنے اندر لے لے گی۔ کیونکہ ایک دل سے

دوسرے دل تک خفیہ راہ ہوتی ہے ۔

کہ ز دل تا دل یقیں روزن بود
نے جدا و دور چوں دو تن بود
متصل نبود سفال دو چراغ
نور شاں ممزوج باشد درمساغ

حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دو جسم اگر چہ دور اور جدا جدا ہوتے ہیں لیکن بالیقین ایک دل سے دوسرے دل تک مخفی راہ ہے پھر اس نظری کو مولانا ایک مثال سے سمجھا کر بدیہی فرماتے ہیں کہ تم دیکھتے ہو کہ جب دو چراغ روشن ہوں تو ہر ایک کا دیا الگ الگ ہوتا ہے لیکن فضاء میں دونوں کی روشنی مخلوط اور متصل ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک مومن کامل کے قلب کا نور دوسرے ناقص مومن کے قلب کے نور سے متصل اور مخلوط ہو کر ناقص کے نور کو بھی کامل کر دیتا ہے اگر چہ دونوں کے قلب الگ الگ قالب میں ہیں معیتِ صادقین کے اندر عجیب کیمیاوی اثر ہے۔ اسی کو حضرت حافظ شیرازی فرماتے ہیں کہ ۔

کیمیا ایست عجب بندگیِ پیر مغاں
خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند

جتنا ہی زیادہ شیخ کامل کی صحبت نصیب ہوگی اسی قدر اس کے فیوض اور برکات سے مالا مال ہو جاؤ گے۔ مولانا فرماتے ہیں ۔

سالہا باید کہ تا از آفتاب
لعل یابد رنگ رخشانی و تاب

مولانا فرماتے ہیں کہ ایک معتد بہ زمانہ چاہیے کہ آفتاب سے اس کی شعاعیں پتھر کے ذرات پر بحکمِ الٰہی اپنا بتدریج اثر پہنچاتی رہیں یہاں تک کہ وہ ذرّات شدہ شدہ لعل بن جائیں اسی طرح شیخ کامل کا قلب جو ہدایت کا آفتاب ہے اور

جس کے اندر براہِ راست آفتابِ حق سے انوار آتے ہیں اس کی شعاعیں بحکمِ الٰہی طالبِ صادق کے قلب پر بتدریج اپنا اثر کرتی رہتی ہیں۔ ایک مدت کے بعد وہ اپنے باطن میں محسوس کرتا ہے کہ روز بروز طاعات میں جی لگتا جاتا ہے اور گناہوں سے دل ہٹتا جاتا ہے یہی مطلب ہے صوفیہ کے اس قول کا کہ اس کا دل نورانی ہوگیا۔ حاشا وکلا دل میں نور آنے کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دل میں کوئی لالٹین یا گیس جل جاتی ہے۔ حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارا پیر شمس الدین تبریزی آفتابِ حق ہے ۔

شمس تبریزی کہ نورِ مطلق است
آفتاب است و ز انوارِ حق است

حضرت شمس الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ نورِ مطلق ہیں وہ خود ایک آفتاب ہیں اور اس آفتاب کے انوار حق تعالیٰ کے انوار سے مستفاد ہیں۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ شیخ کے قلب میں حق تعالیٰ کے انوار کس راہ سے آتے ہیں اس کا جواب بھی حضرت رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

درمیان شمس دیں روزن رہے
ہست روزنہا نہ شد زاں آگہے

اس آفتابِ حقیقی اور عارفین کے قلوب کے درمیان ایک مخفی راستہ ہے جس سے حق تعالیٰ کے نفحات کرم پے در پے آتے رہتے ہیں، دوسرے لوگ اس دریچۂ باطنی سے آگاہ نہیں ہیں انہیں باطنی نعمتوں کے متعلق حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے تھے کہ ۔

جو دل پر ہم اس کا کرم دیکھتے ہیں
تو دل کو بہ از جام جم دیکھتے ہیں

حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے عارفین کاملین کی اس جلالتِ شان

کو دوسری جگہ یوں فرمایا ہے کہ ؎

خم کہ از دریا درو راہے شود
پیشِ او جیحونہا زانو زند

جس مٹکے کے اندر کوئی نلکی سمندر سے لگی ہو اور اس راستے سے اس مٹکے میں سمندر سے پانی جوش مار رہا ہو تو وہ مٹکا دیکھنے میں تو بظاہر مٹکا ہے لیکن اس کے فیضِ عظیم کے سامنے بڑے بڑے جیحون جیسے دریا زانوئے ادب طے کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب دادا پیر رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے صرف کافیہ تک تعلیم تھی لیکن قلب میں ایک راستہ حق تعالیٰ کی ذاتِ پاک سے ملا ہوا تھا جس کا اثر یہ تھا ؎

بینی اندر خود علومِ انبیاء
بے کتاب و بے معید و اوستا

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ظاہری مبلغِ علم تو صرف کافیہ تک تھا لیکن ؎

خم کہ از دریا درو راہے شود
پیش او جیحونہا زانو زند

حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے چوٹی کے علماء ہند آپ کے سامنے زانوئے ادب طے کرتے تھے۔ اور حضرت مولانا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ تو فرماتے تھے کہ میں حضرت حاجی صاحب کے علم ہی سے معتقد ہو کر ان کا مرید ہوا ہوں۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مثنوی شریف کا جو درس ہوتا تھا اس میں علماء ہند کے علاوہ بیرونِ ہند کے علماء بھی شریکِ درس ہوتے تھے۔ بات کیا تھی بات وہی تھی ؎

خم کہ از دریا درو راہے شود
پیش او جیحونہا زانو زند

جس مٹکے میں سمندر سے راستہ ہو جاتا ہے اس کے سامنے بہت سے جیحون جیسے دریا زانوئے ادب طے کرتے ہیں۔

الغرض حق تعالیٰ کی دوستی کے لیے جن دو شرطوں کا آیت اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ کَانُوْا یَتَّقُوْنَ کے اندر ذکر ہے یعنی ایمان بالغیب اور تقویٰ ان دونوں شرطوں کا حصول عالمِ ارواح میں روح کے لیے ممکن نہ تھا کیونکہ وہاں تو تمام مغیبات سامنے تھیں اور تقویٰ کے اسباب نہ تھے۔

روح مجرد میں اعضاء تھے ہی نہیں جن سے گناہ کا داعیہ پیدا ہوتا ہے اور تقویٰ کی تعریف یہ ہے کہ گناہ کی خواہش اور تقاضے پیدا ہوں اور پھر خوف حق سے ان تقاضوں پر عمل نہ کرے۔ عالم ارواح میں ایسے اسباب مطلقاً موجود نہ تھے نہ وہاں غضب کا مادہ تھا نہ وہاں شہوت کا مادہ تھا نہ وہاں ان تقاضوں پر عمل کرنے کے اسباب تھے، وہاں صرف بندے رہتے ہماری عبدیت پر ولایت کا تاج وہاں نہ رکھا جاتا۔ میاں کی رحمت نے اور ان کے کرم عظیم نے ارواح کو اجسام کے ساتھ دنیا میں بھیج کر بڑا احسان فرمایا ہے کہ آج اس عالمِ ناسوت میں ایمان بالغیب اور تقویٰ کی برکت سے کیسے کیسے غوث اور ابدال و اقطاب و اوتاد اور نجباء و نقباء پیدا ہوئے ہیں اور نہ جانے کتنے بے شمار اولیاء اللہ روئے زمین پر ہوتے رہیں گے۔ میاں کے اس کرم پر جان قربان کر دینا چاہیے کہ غلاموں کو دوست بنانے کے لیے روحوں کو اعضاء عطا فرما کر دنیا میں بھیجا ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

شہوتِ دنیا مثال گلخن است
کہ از و حمام تقویٰ روشن است

دنیا کی یہ خواہشات مثل بھٹی کے ہیں جب ان خواہشات کے تقاضوں کو حق تعالیٰ کی مرضی میں بندہ جلا دیتا ہے تو اس سے تقویٰ کا حمام روشن ہوجاتا ہے۔ لفظِ تقویٰ ایسا جامع لفظ ہے جو اپنے اندر دین کے تمام جزئیات اور کلیات فروع اور اصول کو لئے ہوئے ہے کیونکہ جب ڈر ہوگا تو تمام احکام کو بجالانے کی فکر ہوگی، اسی طرح تمام گناہوں سے بچنے کی فکر بھی ڈر ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ پس تقویٰ یعنی خدا کا خوف تمام اعمال و احکام پر پابندی اور تمام گناہوں سے پرہیز سب کا ذریعہ ہے۔ قرآن کا عجیب اعجاز ہے ایمان بالغیب اور تقویٰ کے اندر سارا دین جمع فرمادیا ہے۔ اور یَتَّقُوْنَ صیغہ مضارع کا ہے جس کے اندر حق تعالیٰ نے یہ بتادیا کہ ہمارے اولیاء ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں مرتے دم تک ڈرتے رہتے ہیں۔ اس ڈر ہی کے سبب انتقال کے وقت ان کے کان میں **لاَ تَخَافُوْا وَلاَ تَحْزَنُوْا** کی بشارت دی جاتی ہے یعنی دنیا میں بہت ڈر چکے، اتنا ڈرتے تھے کہ گوشۂ چشم سے بھی غیر محرم پر نگاہ نہ کرتے تھے اب عالم بدل رہا ہے دنیا میں ہمارے خوف سے تم ہر وقت غمگین رہتے تھے آج کے دن لاتخافوا سے تمہاری مہمان نوازی کی جائے گی یعنی اب خوف مت کرو اور غم نہ کرو۔ اسی کو حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

لاَ تَخَافُوْا ہست نزل خائفاں

یعنی نہ ڈرنے کی بشارت ڈرنے والوں ہی کو دی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ کسی بے خوف سے یہ نہیں کہا کرتے ہیں کہ تم خوف مت کرو، حق تعالیٰ کا اپنے اولیاء سے موت کے وقت لاَ تَخَافُوْا فرمانا صاف دلیل ہے کہ ان کے اندر خوف بھرا ہوا تھا ہر نہی اپنے مخاطب کے اندر منہی عنہ کے اثبات کی دلیل ہوتی ہے۔ یَتَّقُوْنَ کے لفظ سے حق تعالیٰ نے اپنے دربارِ خاص سے غیر مخلصین کو اور فاسقین فاجرین کو نکال دیا۔

عشق از اوّل چرا خونی بود
تا گریزد ہر کہ بیرونی بود

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عشق اوّل وہلہ میں خونی کیوں نظر آتا ہے تا کہ غیر مخلص اور مدعی کاذب ہمت ہار کر راہِ فرار اختیار کر لے۔ اسی مضمون کو ہمارے خواجہ صاحب نے یوں فرمایا ہے کہ ۔

بڑی عشق میں ہیں بہاریں مگر ہاں
گھری خارزاروں سے پھلواریاں ہیں

غیر عاشق ایک زخم لگنے سے راہ فرار اختیار کرتا ہے اور عاشقِ صادق کی شان یہ ہوتی ہے کہ ۔

آں نہ من باشم کہ روز جنگ بینی پشتِ من
آں منم کاندر میانِ خاک و خوں بینی سرے

(سعدیؒ رحمۃ اللہ علیہ)

ایک عاشق صادق کہتا ہے کہ میں وہ نہیں ہوں کہ جنگ کے دن تو میری پیٹھ دیکھے یعنی میں شکست خوردوں کی طرح پشت دکھا کر بھاگنے والا نہیں ہوں میں وہ ہوں کہ تو میرا سر اس وقت خاک اور خون کے درمیان لتھڑا ہوا دیکھ لے گا۔

یَتَّقُوْنَ کے لفظ سے ولایت کی خاص علامت حق تعالیٰ نے بتادی کہ میرا ولی بندہ مجھ سے ہر وقت ڈرتا رہتا ہے اور کیوں ڈرتا ہے؟ محبت کے مارے کہ میاں نہ معلوم میرے ان اعمال سے خوش ہیں یا ناخوش ہیں۔ ایک بزرگ حافظ امام الدین صاحب جو شاہ گلزار صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے ان کا واقعہ یاد پڑا کہ وہ کہیں چلے جارہے تھے کہ کسی دیہاتی ہندو نے ہندی زبان میں یہ شعر گایا۔

جھلنی تو گڑھایوں پیا اپنے مناسے
پیا منا بھاولا کہ نائے

ایک عورت اپنے شوہر کو خطاب کر کے کہتی ہے کہ اے پیا یعنی اے میرے شوہر جھلنی (جو کہ ایک زیور ہے ناک میں عورتیں پہنتی ہیں) تو اپنی طبیعت کے پسند سے بنوالیا ہے لیکن معلوم نہیں ہے کہ آپ کو بھی پسند آوے یا نہ آوے اور مطلب تو صرف پیا کی پسند سے ہے۔

اس شعر کا سننا تھا کہ حضرت حافظ امام الدین صاحب جو صاحبِ نسبت بزرگ تھے سرِ راہ بیہوش ہو گئے ایک حال طاری ہو گیا جب ہوش ہوا تو احباب نے عرض کیا کہ حضرت آپ بے ہوش کیوں ہو گئے؟ فرمایا کہ اس ہندی شعر سے میرے قلب پر ایک کیفیت طاری ہو گئی حق تعالیٰ کی پسندیدگی اور اپنے اعمال کی گندگی کا نقشہ اس شعر میں نظر آ گیا یعنی اس عورت کو اپنے شوہر سے اس درجہ عشق ہے کہ وہ اپنے زیور سے خوش نہیں ہے محض اس بناء پر کہ ابھی میرے شوہر نے اس کو دیکھا نہیں ہے، جب تک وہ دیکھ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار نہ کردے اس وقت تک اس عورت کو اپنی جھلنی کے متعلق تشویش ہے۔ اسی طرح مرنے سے پہلے اپنے اعمال کے متعلق ہم اپنی رائے سے کیسے سمجھ لیں کہ یہ قابلِ قبول بھی ہیں، معیار اور کسوٹی کھوٹے کھرے ہونے کی تو میاں کے پاس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولیاء اللہ مرتے دم تک ڈرتے رہتے ہیں اس ڈر کا کبھی ان سے انقطاع اور انفکاک نہیں ہوتا ہے۔ اگر کسی کے قلب سے یہ ڈر نکل جائے تو اسی وقت اس کی ولایت بھی ختم ہو جائے کیونکہ ولایت کے لیے تقویٰ کی شرط لگی ہوئی ہے اور شرط کے فوت ہونے سے مشروط کا فوت ہونا لازم آتا ہے۔ دنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ اگر آپ کے یہاں کوئی معزز اور محترم مہمان آ جائے اور آپ رات دن اس کا اکرام اور ہر طرح سے اس کی ضیافت و مہمان نوازی

کرلیں لیکن مہمان کے رخصت ہونے کے وقت میں آپ کا دل کھٹکتا ہے کہ نہ معلوم اس مہمان معزز کے مزاج پر کون سی بات گراں خاطر ہوئی ہو، کیونکہ ضیافت اور مہمان نوازی تو ہم نے اپنی عقل اور اپنی طبیعت و مذاق کے مطابق کی ہے مہمان کے مذاق اور مزاج کا پورا علم نہ کسی کو ہوتا ہے نہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ رات دن ساتھ رہنے والے خادموں کو سالہا سال مزاج شناسی سکھانے کے باوجود ان سے بعض خدمات مزاج کے خلاف ہو ہی جاتی ہیں جب ہم کو اپنی طبیعت کا اور مزاج کا یقینی علم پوری طور پر نہیں ہوتا ہے تو دوسروں کی طبیعت جو ہمارے احساس سے بھی الگ تھلگ ہے اس کا علم کیسے ہوسکتا ہے۔ طبائع اور امزجہ کا یقینی علم مخلوقات کے لیے حاصل ہونا عقلاً محال ہے۔ یہ صرف خالق کی شان ہے جو اپنے پیدا کئے ہوئے تمام ذرّات کے اتصال اور انفصال سے پورا پورا باخبر ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿الَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ﴾

(سورۃ الملک، آیت: ۱۴)

بھلا کیا وہی نہ جانے جس نے پیدا کیا ہے اور وہ بہت باریک بیں اور پورا باخبر ہے۔

حاصل یہ ہے کہ جب وہ معزز مہمان رخصت ہونے لگتا ہے تو میزبان صدہا اکرام اور خدمات کے باوجود ادب سے عرض کرتا ہے کہ آپ کی کماحقہٗ ہم سے خاطر نہ ہوسکی کوئی بات گراں خاطر ہوئی ہو تو اس کو معاف فرمائیے گا۔ جب ایک انسان دوسرے انسان کا کماحقہٗ حق ادا نہیں کرسکتا ہے تو اللہ تو اللہ ہے وہ خالق اور مالک ہے۔ دنیا میں عالمِ غیب کے نمونے موجود ہیں۔ اللہ والے جو اپنے اعمال اور اذکار پر نازاں ہونے کے بجائے ڈرتے رہتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی سمجھ حق تعالیٰ نورانی فرمادیتے ہیں، وہ نفس سے یوں کہہ دیتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ میرے مرنے کے بعد مجھ سے فرمادیں گے کہ تیرے

اعمال سب قبول ہیں اس وقت ان اعمال پر اچھلیں گے اور خوشیاں منائیں گے، دنیا میں چونکہ اپنے اعمال کے متعلق ہم کو میاں کی خوشی اور ناخوشی کا یقینی علم نہیں ہے اس لیے دنیا ناز کی جگہ نہیں ہے۔ یہاں ناز کرنا اعمال پر بے جا ہے اور قبل از وقت ناز ہے۔ اسی کو حضرت بڑے پیر صاحب فرماتے ہیں ؎

ایماں چو سلامت بلبِ گور بریم
احسنت بریں چستی و چالاکی ما

حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب ایمان کو سلامتی سے ہم قبر میں لے جاویں گے تو اس وقت ہم اپنی چستی اور چالاکی پر آفریں کہیں گے اور دنیا میں جب تک دین کی کشتی نفس و شیطان کے تھپیڑوں سے دوچار ہے اس وقت تک ناز کرنا حماقت ہے۔ یہ وقت تو ہر وقت حق تعالیٰ سے آہ وزاری کے ساتھ سلامتی کے ساتھ پار ہونے کی دعا کرنے کا ہے ؎

خوش سلامت ما بہ ساحل باز بر
اے رسیدہ دست تو در بحر و بر

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ کَانُوْا یَتَّقُوْنَ میں لفظ اٰمَنُوْا سے حق تعالیٰ نے تمام بے ایمانوں کو اپنے دربار سے نکال دیا اس کے بعد یَتَّقُوْنَ فرما کر بے عمل اور بے خوف اہلِ ایمان مدعیانِ باطل کو نکال دیا۔

متقین بندوں کو اہل اللہ کہتے ہیں اہل اللہ کا ترجمہ زبانِ محبت میں یہ کرتا ہوں: اہل اللہ یعنی اللہ کے گھر والے۔ اسی کو حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

ہاں و ہاں ایں دلق پوشان من اند
صد ہزار اندر ہزاراں یک تن اند

مولانا حق تعالیٰ کی طرف سے حکایۃً فرماتے ہیں کہ ہاں وہاں یعنی خوب سن لو کہ

یہ گدڑی پوش ہمارے خاص بندے ہیں، ہمارے تعلقِ خاص کی برکت سے ان کا ایک تن لاکھوں انسانوں سے ایک امتیازی شرف رکھتا ہے۔

ضعف قطب از تن بود در روح نے
ضعف در کشتی بود در نوح نے

قطب کا ضعف صرف تن میں ہے یعنی مجاہدات اور کثرتِ طاعات سے نیز غلبۂ محبت سے ان کا جسم تو بظاہر کمزور ہے لیکن باطن میں تعلق مع اللہ کے فیض سے ایسی قوت رکھتے ہیں جس کے سامنے تمام مادی قوتیں ہیچ ہیں۔ یہ ضعف صرف کشتی میں ہے نوح علیہ السلام میں نہیں ہے۔

ان کے قلب کو چونکہ انعام ولایت کا شرف حاصل ہے اس لیے وہ ہفتِ اقلیم کی طرف رخ کرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔

حضرت بڑے پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جب شاہِ سنجر نے عرض کیا کہ حضرت آپ کی خانقاہ کا خرچ بہت ہے اگر اجازت ہوتو نیمروز کا ملک خانقاہ کے لیے وقف کردوں حضرت بڑے پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں دو شعر لکھ بھیج دیئے۔

چوں چترِ سنجری رُخ بختم سیاہ باد
گر در دلم بود ہوس ملک سنجرم
آں گہہ کہ یافتم خبراز ملک نیم شب
من ملک نیمروز بیک جونمی خرم

بڑے پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمادیا کہ شاہ سنجر کے چتر کی طرح میرا نصیبہ سیاہ ہوجاوے اگر میرے دل میں ملک سنجر کی ذرا بھی ہوس ہو جس وقت سے کہ حق تعالی نے ہمیں آدھی رات کی سلطنت یعنی تہجد کی نمازوں میں حق تعالی

کے ساتھ سرگوشی ومناجات کی لذت عطا فرمائی ہے میں ملک نیمروز کو ایک جو کے عوض میں نہیں خرید سکتا ہوں۔

ملک دنیا تن پرستاں را حلال
ما غلام ملک عشق لازوال

حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ملک دنیا تن پرستوں کو مبارک ہو ہم تو ملکِ عشقِ حقیقی کے غلام ہیں جس کو کبھی زوال نہیں ہے منعم علیہم بندوں کی یہی شان ہے۔ جب دل باطنی نعمتوں سے بھرا ہوتا ہے تب وہ یہ نہیں کہتا کہ پچاس روپیہ لاؤ تو وعظ کہوں گا، پچیس روپیہ دو تو سلام پڑھوں گا۔ یہ خوب ہے اللہ اور رسول کی محبت کہ جو پچاس روپے اور پچیس روپے میں بکتی پھرتی ہے۔ ان کے یہ کارنامے بتاتے ہیں کہ یہ منعم علیہم نہیں ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام یافتہ نہیں ہیں۔

ہمارے حضرت مرشد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تو یہاں تک فرماتے تھے کہ جب کسی عالم کو بہت تکلفات کے لباس میں آراستہ دیکھتا ہوں تو دل میں وسوسہ گذر جاتا ہے کہ یہ شاید خالی خولی ہے یعنی اس کا باطن دین کی حلاوت سے محروم ہے کیونکہ ایمانِ کامل کی علامت سادگی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اَلْبَذَاذَةُ مِنَ الْاِيْمَانِ﴾

(سنن ابن ماجة، كتابُ الزهد، باب ما يؤبه لهٗ)

سادگی ایمانِ کامل کی علامت ہے جس کو آخرت کا غم سوار ہوتا ہے اسے دنیا کے نقش ونگارظاہری بہلاوے نہیں دے سکتے ہیں۔ وَمَا اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ پر مومنِ کامل کا عمل ہوتا ہے۔ **منعم علیہم** بندوں کی شان قرآن میں یہی بیان فرمائی گئی ہے کہ وہ دین کی باتوں کو قوم تک پہنچاتے ہیں اور قوم سے کہتے ہیں کہ:

﴿يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾

(سورۃ ھود، آیت: ۵۱)

وہ انعام یافتہ یعنی انعامِ نبوت سے مشرف بندہ اپنی قوم کو دینی دعوت دے کر یہ کہتا ہے کہ اے میری قوم میں تم لوگوں سے اس پر (یعنی دعوتِ توحید پر) کچھ معاوضہ نہیں مانگتا میرا معاوضہ تو صرف اس کے ذمے ہے جس نے مجھ کو پیدا کیا ہے پھر کیا تم نہیں سمجھتے۔

یہ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ عجیب عبرت کا کوڑا ہے کہ بھلا وہ شخص جو بدون معاوضہ اپنا کاروبار چھوڑ کر اللہ کی طرف تم کو بلاتا ہے تو باقتضاء عقل تمہیں ایسے شخص کی نسبت بدگمانی کی راہ نہیں ہے، بدگمانی کی راہ تو اس وقت تھی جب کہ وہ تم سے یہ کہے کہ میری فیس ایک رات تقریر کرنے کی مثلاً پچاس روپے ہیں۔افسوس کہ اس زمانے میں ایسے ہی لوگوں کو عوام اپنا مقتدا اور امام بھی بنائے ہوئے ہیں۔

إِذَا كَانَ الْغُرَابُ دَلِيْلُ قَوْمٍ
سَيَهْدِيْهِمْ طَرِيْقَ الْهَالِكِيْنَ

جب کسی قوم کا راہبر کوا بن جائے گا تو عنقریب قوم کو ہلاک ہونے والوں کا راستہ دکھاوے گا۔

اللہ والا دین کو اس طرح بیچتا نہیں پھرتا ہے، ان کے اندر ایک خاص شانِ استغناء کی ہوتی ہے اور یہ استغناء تکبر کے سبب نہیں ہوتا ہے بلکہ غلبۂ توحید کے سبب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس شانِ استغناء کے باوجود وہ کسی کی دل آزاری نہیں کرتے ہیں ان کے اخلاق ایسے پاکیزہ ہوتے ہیں کہ کتنے بندے محض ان کے اخلاق سے متاثر ہو کر ہدایت پا جاتے ہیں۔ حضرت مرشدی رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں رمزی اٹاوی نے خوب لکھا ہے کہ ۔

نہ لالچ دے سکیں ہرگز تجھے سکوں کی جھنکاریں
ترے دستِ توکل میں تھیں استغناء کی تلواریں

اللہ والا وعظ کہہ کر فیس نہیں لیتا ہے محض اللہ کے لیے دین کی طرف اللہ کے بندوں کو دعوت دیتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو ساڑھے نوسو برس تبلیغ کرتے رہے مگر ان کی فیس کیا تھی؟ صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنی قوم سے ہمیشہ فرماتے رہے کہ:

﴿وَيَا قَوْمِ لاَ اَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالاً اِنْ أَجْرِىَ اِلاَّ عَلَى اللهِ﴾
(سورۂ هود، آیت: ۲۹)

اور اے میری قوم میں تم سے اس دینی دعوت پر کچھ مال نہیں مانگتا میرا معاوضہ تو صرف اللہ کے ذمہ ہے۔

صراطِ مستقیم کو انعام یافتہ بندوں سے ڈھونڈنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ میں صراطِ مستقیم کے متعلق بتادیا ہے کہ صراطِ مستقیم دراصل صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ہے یعنی جن بندوں پر حق تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے انہیں سے سیدھا راستہ مل سکتا ہے اور انعام یافتہ بندوں کی تفسیر حق تعالیٰ نے پانچویں پارے میں فرمادی:

﴿الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ﴾
(سورة النسآء، آیت: ۶۹)

وہ بندے جن پر کہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا ہے وہ نبیین ہیں صدیقین ہیں شہداء اور صالحین ہیں۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام پر ہر ایک جماعت منعم علیہم کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ نبی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ کی طرف سے وحی آوے یعنی فرشتہ ظاہر میں پیغام کہہ جاوے اور صدیق وہ ہے کہ جو وحی میں آئے ان کا جی آپ ہی اس پر گواہی دے اور شہید وہ ہے جن کو پیغمبر

صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر ایسا صدق آیا کہ اس پر جان دیتے ہیں اور نیک بخت وہ جن کی طبیعت نیکی ہی پر پیدا ہوئی ہے۔

ان انعام والے بندوں کو اللہ تعالیٰ کا انعام دے دینا دنیا و مافیہا کی سلطنت سے مستغنی رکھتا ہے ان کی تبلیغ اور دعوۃ الی اللہ بدون معاوضہ ہوتی ہے۔

بدون اجرت ہر نبی کا اپنی قوم کو تمام عمر تبلیغ کرنا اور ان کا قوم کی طرف سے طرح طرح کی ایذا رسانیوں پر صبر جمیل کا پہاڑ ہونا یہ خود پتہ دیتا ہے کہ ان کے باطن میں کوئی نعمت عظیمہ ہوتی ہے جو ان کو اجرت سے مستغنی کر دیتی ہے اور تکلیف پر صبرِ جمیل کا پہاڑ بنائے رکھتی ہے۔ اللہ والوں کی طرف سے دعوۃ الی اللہ اور اہلِ شر کی طرف سے مسلسل فتنہ پردازی کے متعلق مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ عجیب عبرت ناک مضمون بیان فرماتے ہیں۔

زاغ در رز نعرۂ زاغاں زند
بلبل از آواز او کے کم کند

کوا میدان میں اپنی آواز غالب کرنا چاہتا ہے لیکن بلبل اس کی آوازِ مکروہ سے اپنی خوش آوازی ترک نہیں کرتی ہے، اسی طرح دین کے مخالفین کی مکروہ شورشوں سے اہلِ حق نے اپنا تبلیغی کام بند نہیں کیا ہے۔

گر پلیدی پیش ما رسوا بود
خوک و سگ را شکر و حلوا بود

اگرچہ ہمارے نزدیک یعنی اہلِ حق کے نزدیک پلیدی یعنی بد دینی رسوا ہے یعنی بری ہے لیکن خنزیر طبع اور سگ خصلت اشخاص کے لیے بد دینی ہی حلوا ہے۔

نُقل خارستان غذائے آتش است
بوئے گل قوت دماغ سرخوش است

خاردار درخت آگ کی خوراک ہوتے ہیں اور پھول کی خوشبو پاکیزہ دماغ کی غذا ہوتی ہے یعنی اہلِ حق کے دینی کارناموں میں رخنہ اندازی اہل نار کا شیوہ ہوتا ہے اور اہل اللہ کے باطنی پھول یعنی نسبت مع اللہ کے فیوض و برکات کی خوشبو پاکیزہ طبائع کی غذا ہوتی ہے۔

صراطِ مستقیم یعنی دین کا راستہ اللہ والوں کی صحبت کے بدون ملنا محال ہے۔ اور یہ دعویٰ ہمارا نہیں ہے قرآن کا دعویٰ ہے سورۂ فاتحہ میں صراطِ مستقیم کی حق تعالیٰ نے جو تفسیر فرمائی ہے اسی کے اندر یہ دعویٰ موجود ہے کیونکہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں صراط مستقیم کا بدل ہے اور بقاعدہ نحو مقصود بدل ہی ہوا کرتا ہے، درخواست ہی میں بتادیا کہ تم جو سیدھا راستہ مجھ سے طلب کرتے ہو تو وہ سیدھا راستہ ہمارے انعام یافتہ بندوں کا راستہ ہے صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ، راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے اور ایک جگہ حق تعالیٰ نے اسی مضمون کو اور مؤکد فرمایا ہے فرماتے ہیں:

﴿وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ﴾

(سورۂ لقمان، آیت:۱۵)

جو بندے کہ میری طرف متوجہ ہیں ان کا راستہ اختیار کرو ظاہر ہے کہ اللہ کی طرف متوجہ رہنے والے اور رجوع کرنے والے اللہ والے ہی ہوتے ہیں۔ بندہ اللہ والوں ہی کے ذریعے اللہ کے دربار میں پہنچتا ہے۔ راستے کی سیدھائی راہبر کی سیدھائی پر موقوف ہے اور راستے کی کجی راہبر کی کجی سے ہوتی ہے۔ ایک ناواقف مسافر جب اسٹیشن پر اترتا ہے تو اپنا سامان ہر مدعی راہبر کے حوالے نہیں کرتا ہے وہ فوراً قلی کی تلاش میں لگ جاتا ہے قلی کی خاص وردی دیکھ لینے پر بھی مطمئن نہیں ہوتا جب تک قلی کے بازو پر سرکاری نمبر نہیں دیکھ لیتا اور جب اس نمبر کو محفوظ کرلیتا ہے تب اس کی اقتداء کرتا ہے، سارا سامان اس کے حوالے

کر کے اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ دنیا کے نمونے آخرت کے لیے نمونۂ عبرت ہیں۔ جب دنیا کا سامان بدون قلی کا نمبر معلوم کیے ہوئے اس کے حوالہ نہیں کرتے ہیں تو دین ہی کیا ایک ایسا سستا سودا ہے جو ہر کس و ناکس کے سپرد کر دیا جائے۔ مولانا فرماتے ہیں ۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نباید داد دست

مولانا فرماتے ہیں کہ اے لوگو بہت سے ابلیس آدمی کی صورت میں پھرتے ہیں، پس ان ابلیس خصلت انسانوں کے ہاتھ میں اپنا دین مت سونپ دینا۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے صراطِ مستقیم فرمانے کے بعد ان افراد کی علامت بھی بیان فرمادی جن کے ذریعہ سے صراطِ مستقیم پر چلنا نصیب ہوتا ہے صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے اہل اللہ کی صحبت اختیار کرنے پر اس قدر قوی استدلال ہے جس کا انکار رد النصوص کے مترادف ہے۔ انعام پانے والے بندے سیدھے راستے پر چل کر دربار سے انعام حاصل کر چکے ہیں وہ دربار تک پہنچے ہیں تمہیں بھی دربار تک پہنچا دیں گے۔ دربار تک پہنچا ہوا بندہ محقق ہوتا ہے اس کی بات میں یقین کا نور ہوتا ہے جو سامع کے دل کو متاثر کر دیتا ہے۔ برعکس اناڑی جو خود راستہ طے نہیں کیے ہوئے ہے اس کی بات میں یقین کا اثر نہیں ہوتا ہے جو کچھ بزرگوں کی کتابوں سے علوم اور معارف چرا کر بیان بھی کرتا ہے تو وہ باتیں اس کی زبان سے بہکی بہکی سی معلوم ہوتی ہیں کیونکہ وہ خود ان باتوں کی لذت سے نا آشنا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے امرتی کبھی نہ کھائی ہو اور وہ کسی کتاب سے پڑھ کر یا کسی امرتی کھانے والے سے سن کر امرتی کی لذت کو بیان کرے تو اس کے چہرے اور لب ولہجہ سے امرتی کی لذت کا درجۂ حال اور درجۂ یقین ظاہر نہ ہوگا۔ ہمارے خواجہ صاحب فرماتے ہیں ۔

یک نظر میں آشیاں گم گشتہ کو
بھانپ لیں ہم ہئیت پرواز سے

دوسری مثال غیر محقق کی یہ ہے کہ جیسے ایک شخص جغرافیہ کا نقشہ دیکھ کر امریکہ کا راستہ کسی کو سمجھا رہا ہو اور دوسرا شخص جو امریکہ کو خود آنکھوں سے دیکھ آیا ہو اور وہ کسی کو امریکہ کا راستہ سمجھا رہا ہو دونوں کی باتوں میں اور لب و لہجے میں اور طرزِ تقریر میں باعتبار کیفیت اور حالت اور یقین کے زمین اور آسمان کا فرق محسوس ہوگا۔ انہیں دونوں مثالوں سے محقق پیر اور اناڑی پیر کا فرق سمجھ لینا چاہیے۔

چراغ مردہ کجا شمع آفتاب کجا

حق تعالیٰ نے انعام یافتہ بندوں کی جو تفسیر پانچویں پارے میں ارشاد فرمائی ہے اس میں ان کی علامات بھی موجود ہیں یعنی نبوت صدیقیت شہادت اور صلاحیت کی جن بندوں پر سرکاری مہریں لگی ہوئی ہیں انہیں سے سیدھا راستہ حاصل ہوگا۔ نبی کی نبوت صدیق کی صدیقیت شہداء کی شہادت صالحین کی صلاحیت پتہ دیتی ہے کہ یہ حضرات انعامات سے نوازے گئے ہیں اور ان نعمتوں کو انعام فرما کر عجیب بات بتادی کہ دنیا کے تمام خزانے ایک طرف اور ہمارے یہ انعامات ایک طرف۔ دنیا اور دنیا کی تمام نعمتیں ان انعامات کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہیں کیونکہ دنیا کی نعمتوں کو حق تعالیٰ نے متاعِ غرور فرمایا ہے ان کو انعام نہیں فرمایا ہے، دنیا کی دولت وسلطنت دھوکے کی پونجی ہے۔

انعام نبوت کے بعد انعام صدیقیت کا درجہ ہے۔ حضرت مولانا اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ صدیق آئینۂ نبوت ہوتا ہے نبیین، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ رفاقت سے صراطِ مستقیم یعنی سیدھا راستہ ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کے متعلق وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا فرمایا ہے اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔ ان انعام پانے والے بندوں کو

حق تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے کہ یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں تو یہ محض خبر دینا نہیں ہے بلکہ اس خبر سے مقصود یہ ہے کہ ان کو اپنا رفیق بنالو، ہم فرما رہے ہیں کہ یہ بہت اچھے ساتھی ہیں تم اپنی سمجھ سے نہ جانے کس بدترین کو اپنا ہمقرین بنالو۔ اسی کو حضرت عارف فرماتے ہیں ؎

مہر پاکاں درمیان جاں نشاں
دل مدہ الا بمہر دل خوشاں

پاک بندوں کی محبت کو اپنی جان میں پیوست کرلو خبردار دل کسی کو مت دینا مگر ان کو جن کے دل اللہ کی محبت سے اچھے ہو گئے ہیں:

﴿اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ﴾

(سورۃ الشعراء، آیت: ۸۹)

قلبِ سلیم کا ترجمہ حضرت مرشدی رحمۃ اللہ علیہ نے پاک دل فرمایا ہے۔ پاک بندوں کے سینوں میں پاک دل ہوتا ہے۔ حضرت فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

بے رفیقے ہر کہ شد در راہِ عشق
عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

بے رفیق یعنی رہبر کے بغیر جس نے عشق کے راستے میں قدم رکھا اس کی عمر گزر گئی اور عشق سے آگاہ نہ ہوا۔

رفیق کا لفظ قرآن میں موجود ہے بزرگانِ دین بڑے پتے کی بات کہتے ہیں ان کی سب باتیں قرآن وحدیث ہی سے ماٴخوذ ہوتی ہیں مگر علماء ظاہر کی نگاہ وہاں تک رسا نہیں ہوتی ہے۔ مفسرین نے وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا میں رفاقت سے رفاقت فی الآخرۃ مراد لیا ہے۔ لیکن وہ رفاقت فی الآخرہ دنیا ہی کی رفاقت کا ثمرہ ہوگی جس نے دنیا میں ان پاک بندوں کو اپنا رفیق نہ بنایا ہوگا

اس کو وہاں بھی ان حضرات کا ساتھ نصیب نہ ہوگا۔

آگے ذٰلِکَ الْفَضْلُ مِنَ اللهِ فرمایا ہے یعنی جس کو ہمارے پاک بندوں کا ساتھ نصیب ہے تو سمجھ لو کہ اس پر ہمارا بڑا فضل ہے۔ ہم جس پر اپنا فضل کرنا چاہتے ہیں اس کو اپنے پاک بندوں کی صحبت اور رفاقت نصیب کرتے ہیں۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ جس بندے کو اللہ تعالیٰ اپنا بنانا چاہتے ہیں تو اس کے دل میں اپنے مقبول بندوں کی محبت ڈال دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے منعم علیھم بندوں کو اچھے رفیق فرما کر یہ بتادیا کہ ان سے صراطِ مستقیم تم کو کب ملے گا جب تم ان پاک بندوں کو اپنا رفیق یعنی ساتھی بنالو گے۔ ساتھ پکڑنے کو لفظِ رفیق سے ضروری فرمادیا کیونکہ اپنا رفیق ہم اسی کو کہہ سکتے ہیں جس کی صحبت میں ہم بیٹھتے بھی ہوں، ساتھی تو وہی ہوتا ہے جس کے ساتھ رہا بھی جائے۔ رفاقت کا لفظ اپنے اندر التزامِ صحبت کو لئے ہوئے ہے۔ ابلیس جو مردود ہوا تو نیکوں کا ساتھ چھوڑنے کے سبب ہوا۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿اَبٰی اَنْ یَّکُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ﴾
(سورۃ الحجر، آیت: ۳۱)

پس شیطان نے سجدہ کرنے والوں کا سجدے میں ساتھ دینے سے انکار کیا اس سے معلوم ہوا کہ نیک بختوں کے نیک کام میں ساتھ رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان سے مواخذہ کس عنوان سے فرمایا ہے، فرماتے ہیں مَا لَکَ اَنْ لَّا تَکُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ اے ابلیس! ملعون تجھ کو کیا ہوگیا کہ تو نے ساجدین یعنی ملائکہ کا ساتھ نہیں دیا۔ ابلیس نے اس فعل سے تمام ساجدین کی تحقیر کی اس امر سے وہ لوگ متنبہ ہو جائیں جو اہلِ دین کی تحقیر کر کے اپنے ایمان کو برباد کرتے ہیں۔

رفق کے معنی لغت میں نرمی کے ہیں جس میں یہ اشارہ بتا دیا کہ ہمارے پاک بندے بڑے رحم دل اور نرم دل ہوتے ہیں وہ تمہاری تربیت میں بڑی شفقت اور رحمت سے کام لیں گے۔ ان کی ڈانٹ ڈپٹ اور غضب میں بھی رحمت ہوگی کیونکہ منشا اس کا تمہاری اصلاح ہے۔ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جس کا پیر کڑا ہوتا ہے اس کی خوب اصلاح ہوتی ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ سچا پیر عین غصے اور ڈانٹ ڈپٹ کی حالت میں بھی تم کو حقیر اور ذلیل سمجھ کر کوئی بات منہ سے نہ نکالے گا۔ حضرت مرشدی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں جب کسی مرید کو ڈانتا ہوں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میں بھنگی ہوں اور یہ مرید شاہزادہ ہے، بادشاہ کا حکم ہوا ہے کہ اس کے درّے لگاؤ لیکن بھنگی کے دل سے پوچھو کہ وہ عین تعمیلِ حکم کے وقت بھی کانپتا رہتا ہے کہ بادشاہ کا رخ کہیں میری طرف سے بدل نہ جائے وہ بھنگی عین درّے لگانے کے وقت بھی شاہزادے کو شاہزادہ ہی سمجھتا ہے اور اپنے کو بھنگی ہی سمجھتا ہے۔ اللہ والے تو کافروں کو بھی حقیر نہیں سمجھتے ہیں تو پھر مسلمانوں کو بھلا وہ کیا حقیر سمجھیں گے۔ حضرت عارف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

ہیچ کافر را بخواری منگرید
کہ مسلمان بودنش باشد امید

مولانا فرماتے ہیں کہ کسی کافر کو بھی حقارت کی نگاہ سے مت دیکھو کیونکہ مرنے سے پہلے پہلے اسلام قبول کرنے کی امید اس سے باقی ہوتی ہے۔ ذٰلِکَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ کے بعد وَ كَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا فرما کر یہ بتا دیا کہ ہمارے علم میں تمہارے لیے جو بہترین رفیق ہیں یعنی ہمارے مقبول اور پاک بندے نبیین صدیقین شہدا اور صالحین ان کی رفاقت کے حسن اور خوبی میں ذرا بھی شبہ مت کرنا کیونکہ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِيْقًا فرمانے والا میں ہوں۔ پس میرا علم

تمہارے لیے کافی ہے اگر تم اپنے ناقص علم سے کام لوگے تو کافروں کی طرح پچھتاؤ گے۔ کفار اپنی خودرائی سے آج کے دن اپنے ناقص مبلغ علم سے برے رفیقوں کو انتخاب کررہے ہیں اور میرے رسول سے اعراض کررہے ہیں کل قیامت کے دن انہیں کی زبان حسرت سے کہے گی:

﴿يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا﴾

(سورۃ الفرقان، آیت:۲۷)

ترجمہ: اے کاش! میں نے رسول کے ساتھ صراط مستقیم اختیار کیا ہوتا۔

اور کہے گا:

﴿يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا﴾

(سورۃ الفرقان، آیت:۲۸)

ہائے افسوس! کاش فلاں کو میں نے اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ جس کے مبلغ علم اور مبلغ عقل کا انجام یہی ہے وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا کافی وافی علم تو اللہ کا ہے۔ حضرت مرشدی رحمۃ اللہ علیہ کی غلامی کا صدقہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ایسے تفسیری لطائف زبان سے کہلوائے، ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ یہی فرمایا کرتے تھے کہ عادۃ اللہ یہی ہے کہ بدون کسی بندۂ کامل کے ساتھ تعلق قائم کئے ہوئے اصلاح نہیں ہوتی۔ جس طرح اصلاح فرض ہے اسی طرح اس فرض کا ذریعہ حصول یعنی کسی مصلح کامل سے تعلق بھی فرض ہے بیعت خواہ ہو یا نہ ہو بیعت کا ہونا فرض نہیں ہے البتہ برکت کی چیز ضرور ہے سنت کا طریقہ ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ کسی کو مرید کرلینا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی کو بیٹا بنالیا جائے۔ مرید ہونے سے مرید اور شیخ میں طرفین سے رفاقت کا تعلق قوی ہوجاتا ہے۔ اور اسی رفاقت ہی پر حصولِ صراطِ مستقیم موقوف ہے۔ حضرت والا کے ارشادات اور تعلیمات کے متعلق ایک بار ایک شعر موزوں ہوگیا حالانکہ میں شاعر نہیں ہوں مگر بڑے کام کا شعر ہوگیا۔

ہمیں نقشِ قدم اشرف علی ملحوظ رکھنا ہے
جو کچھ فرما گئے ہیں وہ اسے محفوظ رکھنا ہے

اوّل مصرعہ میں عملی حیثیت کی حفاظت ہے اور ثانی مصرعہ میں علمی حیثیت کی حفاظت ہے۔ علماء ربانین کے تمام ارشادات سب کے سب قرآن اور حدیث ہی سے مستنبط ہوتے ہیں ہاں یہ دوسری بات ہے کہ وہاں تک ہماری نگاہ نہ پہنچے۔

علماء ربانین پر ایک واقعہ یاد پڑا۔ ایک بار حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوئے اسی وقت قصبہ میں ہمارے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا وعظ ہو رہا تھا حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ان صاحب سے فرمایا کہ یہاں کیا آئے ہو جاؤ وہاں ایک عالمِ ربانی کا وعظ ہو رہا ہے۔

اوپر جن دو آیتوں میں کافروں کی حسرتوں کو دو عنوان سے حق تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے ان دونوں عنوانوں میں سے ایک عنوان حسرت کا یہ ہے کہ کاش میں نے رسول کا ساتھ اختیار کیا ہوتا اس عنوان میں حصولِ منفعت کا طریقہ بتا دیا گیا یعنی رسول کے ساتھ اگر راستہ اختیار کیا جاتا تو سیدھی راہ چلتے اور جنت میں پہنچتے دوسرا عنوان حسرتِ کفار کا یہ ہے کہ اے کاش! میں نے فلاں برے ساتھی کو دنیا میں اپنا دوست نہ بنایا ہوتا اس عنوان میں دفعِ مضرت کا طریقہ بتایا گیا ہے یعنی اگر برے ساتھی کو دوست نہ بناتے تو اس کے برے اخلاق و عادات ہمارے اندر نہ پیدا ہوتے۔ ان دونوں آیتوں کے تقابل سے معلوم ہوا کہ جس طرح حصولِ منفعت ضروری ہے اسی طرح دفعِ مضرت بھی ضروری ہے پس حق تعالیٰ شانہٗ نے صراطِ مستقیم کے بعد اس کے حصول کا نافع ذریعہ پہلے بیان فرما دیا یعنی انعام والے بندوں کا ساتھ اختیار کیا جاوے اگر نبی یا رسول موجود ہو تو اس کا ساتھ ورنہ ان کے بعد ان کے سچے نائبین یعنی علماء

ربانین کا ساتھ پکڑا جاوے۔

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کُوْنُوْا رَبَّانِیِّیْنَ تم لوگ ربانی بن جاؤ۔ ربانیین کی تفسیر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمائی ہے کہ اَیْ کُوْنُوْا عُلَمَآءَ فُقَھَآءَ حُکَمَآءَ اس سے معلوم ہوا کہ عالم ربانی ہر عالم نہیں ہوا کرتا ہے۔ عالم ربانی بننے کے لیے دو شرطیں ہیں ایک یہ کہ وہ فقیہ بھی ہو اور حکیم بھی ہو، یہاں حکیم سے مراد حکمت یونانی جاننے والا نہیں ہے بلکہ حکمت ایمانی جاننے والا مراد ہے۔

حکمت کا ترجمہ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے خوش فہمی سے کیا ہے۔ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کو کتاب کی تعلیم دیتے ہیں اور خوش فہمی کی۔ دین کی خوش فہمی اسی عالم کو نصیب ہوتی ہے جو اللہ والا ہوتا ہے۔ اسی کو حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

اے بسا عالم ز دانش بے نصیب
حافظ علم است آنکس نے حسیب

اے لوگو! بہت سے عالم دین کی خوش فہمی سے محروم ہیں وہ صرف علوم کے نقوش ظاہری کے حافظ ہیں حسیب نہیں ہیں ؎

جان جملہ علمہا این ست ایں
کہ بدانی من کئیم دریوم دیں

تمام علوم کی روح صرف یہ ہے کہ آدمی یہ جان لے کہ کل قیامت کے دن ہماری کیا قیمت ہوگی کیونکہ اہلِ دنیا کو اپنے عیوب کے متعلق دھوکہ دیا جاسکتا ہے لیکن حق تعالیٰ کے سامنے تو سب اترے پترے کھل جاویں گے۔

عالمِ ربّانی عالم باعمل ہوتا ہے، حق تعالیٰ کا خوف اس کے ہر قول اور

فعل سے ٹپکتا ہے۔ علمِ حقیقی کی شان یہی ہے کہ اس سے خشیتِ دل پیدا ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ کے نزدیک عالم وہی ہے جو اللہ سے ڈرتا رہتا ہے فرماتے ہیں:

﴿اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓءُ﴾

(سورۃ الفاطر، آیت:۲۸)

وہی بندے خدا سے ڈرتے ہیں جو اس کی عظمت کا علم رکھتے ہیں۔ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خشیتِ الٰہیہ علمِ حقیقی کی ایک لازمی صفت ہے۔ اگر خشیت دل میں نہ ہو تو وہ عالم اللہ کے نزدیک عالم کے مرتبے میں نہیں ہے۔

صراطِ مستقیم یعنی حق تعالیٰ کا سیدھا راستہ ہمیشہ متقی عالم سے حاصل کرنا چاہیے۔ بے عمل عالم جس نے خود اپنی اصلاح کسی بزرگ سے نہیں کرائی ہے اس کا نفس اس کے علم کو اپنی خواہشات کا غلام بنالیتا ہے۔ قرآن اور حدیث کی خاصیت اور خوشبو کو پاکیزہ قلب سے اور پاکیزہ زبان سے حاصل کرنا چاہیے۔ اس کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے:

﴿وَیُزَکِّیۡھِمۡ وَیُعَلِّمُھُمُ الۡکِتَابَ وَالۡحِکۡمَةَ﴾

(سورۂ ال عمران، آیت:۱۶۴)

اس آیت میں حق تعالیٰ نے تعلیمِ کتاب اور تعلیمِ حکمت سے پہلے تزکیۂ نفس کو مقدم فرمایا ہے اس تقدیم میں حق تعالیٰ نے یہ بتادیا کہ جب قلب رذائلِ نفسانیہ سے پاک کردیا جاتا ہے تب علمِ کتاب اور علمِ حکمت کے انوار کا وہ محل بنایا جاتا ہے۔ گندی شیشی میں عطر نہیں رکھا کرتے ہیں اور اگر کوئی نادان رکھ دے تو وہ گندی شیشی عطر کو بھی خراب کردے گی۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

ہرچہ گیرد علتی علّت شود

متقی عالم سے یہ مراد نہیں ہے کہ ان سے کبھی کوئی معصیت ہی صادر نہیں ہوتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ معصیت پر اصرار نہیں کرتا ہے۔ اگر احیاناً

کوئی خطا ہوگئی تو فوراً سجدہ میں گریہ وزاری اور استغفار میں لگ جاتا ہے۔ جس گناہ پر سچے دل سے بندہ توبہ کرلے اور آئندہ کے لیے حق تعالیٰ سے پختہ عہد کرلے کہ اب پھر یہ گناہ نہ کروں گا لیکن اس کے بعد اگر نفس کے غلبے سے گناہ پھر صادر ہوگیا تو پہلی توبہ بے کار نہیں ہوتی ہے اور نہ یہ اصرار کرنے والوں میں سے ہے البتہ اس دوسری بار کے گناہ کا وبال اس کی گردن پر رہے گا مگر یہ کہ وہ پختہ ارادے کے ساتھ پھر توبہ کرلے کہ اے اللہ! نفس اور شیطان نے مجھے پہلی توبہ سے پھسلا دیا آپ اپنی رحمت سے معاف فرمادیجئے اور خوب گریہ وزاری اور ندامت سے استغفار کرکے پھر کام میں لگ جاوے۔ اسی طرح اگر سو بار بھی توبہ ٹوٹتی رہے تو ہمت نہ ہارے۔ ہمارے خواجہ صاحب فرماتے ہیں ؂

نہ چت کر سکے نفس کے پہلواں کو
تو یوں ہاتھ پاؤں بھی ڈھیلے نہ ڈالے
ارے اس سے کشتی تو ہے عمر بھر کی
کبھی وہ دبا لے کبھی تو دبا لے

اس طرح ہمت سے کام میں لگے رہنے سے ایک دن ایسا بھی آوے گا کہ حق تعالیٰ کو رحم آوے گا کہ یہ بندہ اپنی طرف سے گرتا پڑتا راستہ قطع کر رہا ہے، یہ ضعیف اور عاجز ہے میں قوی اور غالب القدرۃ ہوں۔ پس حق تعالیٰ اس بندے کا ہاتھ پکڑ کر اس کو کھینچ لیتے ہیں یعنی اپنی مدد خاص سے اس کو اپنا بنا لیتے ہیں اور جب ان کی مدد شاملِ حال ہوجاتی ہے تو نفس اور شیطان کے تمام داؤں پیچ بے اثر ہوجائے ہیں۔ چھوٹے بچے کو پہلے خود چلا کر دیکھتے ہیں کیونکہ بچوں کا لڑکھڑاتے ہوئے چلنا ماں باپ کو بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن جب بچہ تھک جاتا ہے تو ماں باپ دوڑ کر گود میں لے لیتے ہیں۔ والدین کی محبت اور شفقت جو حق تعالیٰ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے جب اس میں یہ اثر ہے تو ؂

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند
صاف گر باشد ندانم چوں کند

حق تعالیٰ کی رحمت کا کیا حال ہوگا۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ حق تعالیٰ کی طرف سے حکایۃً فرماتے ہیں ۔

مادراں را مہر من آموختم
چوں بود شمعے کہ من افروختم

ماؤں کو اولاد سے محبت کرنا میں نے ہی سکھایا ہے اور وہ شمع کیسی ہوگی جسے میں نے روشن کیا ہوگا۔ حق تعالیٰ ہماری طرف سے چند دن مجاہدہ اور کوشش دیکھنا چاہتے ہیں پھر اس کے بعد تو وہ خود ہی اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ اپنی عنایت و کرم کے لیے بندوں کی طرف سے کوشش کو شرط ٹھہرا دیا ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾

(سورۃ العنکبوت، آیت: ۶۹)

جو بندے ہماری راہ میں کوششیں کرتے ہیں ہم ان کے لیے اپنے راستے کھول دیتے ہیں۔

مگر یہ کوشش اپنی رائے سے نہ ہو کسی کامل کی اتباع کے ساتھ ہو صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے۔ دین کا راستہ کسی صاحبِ انعام سے ملے گا اور صاحبِ انعام سے مراد کی تفصیل کر چکا ہوں۔

منعم علیہم بندوں کو حق تعالیٰ نے ایسے خطابات عطا فرمائے ہیں جن کے اندر ان کے انعامات کی تصریح بھی مندرج ہے، نبیین کا خطاب انعامِ نبوت کو صدیقین کا خطاب انعامِ صدیقیت کو شہداء کا خطاب انعامِ شہادت کو

صالحین کا خطاب انعامِ صلاحیت کو، ہر خطاب اپنے اندر اپنے انعام کو بھی لیے ہوئے ہے۔ انہیں بندوں کے تعلق سے سیدھا راستہ ملے گا۔ جج اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے خوب کہا ہے ؎

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اللہ والوں کی پہچان کا سہل طریقہ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا تھا کہ جس بندے کی طرف تم دیکھو کہ خواصِ اُمت متوجہ ہیں اس کو تم بھی اپنا مقتدا بنالو۔ عوام کی بھیڑ کو معیار نہ بنانا چاہیے، سو اندھے اگر کسی کے پاس معتقد انہ بیٹھے ہیں تو یہ بھیڑ اس کی مقبولیت اور ولایت کی علامت نہ ہوگی لیکن اگر امت کے چند خواص یعنی علماء متقین صالحین اس کو اپنا بڑا سمجھتے ہیں تو یہ معیار اپنی جگہ پر بے شک معیار ہے۔

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کے بعد حق تعالیٰ شانہٗ نے غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ فرمایا ہے یعنی جس طرح صراطِ مستقیم حاصل کرنے کے لیے انعام یافتہ بندوں کی اتباع ضروری ہے اسی طرح مغضوبین اور ضالین بندوں کی اتباع سے پرہیز بھی ضروری ہے۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ میں جلبِ منفعت یعنی حصول نفع دین کا طریقہ ارشاد فرمایا گیا ہے اور غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ میں دفعِ مضرت کا یعنی دین کو نقصان پہنچانے والے اسباب کے دفاع کا طریقہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ کے اندر اجمالی طور پر پورا دین رکھ دیا ہے۔ سورۂ فاتحہ کو اسی لیے ام القرآن بھی کہتے ہیں یعنی قرآن کی ماں جس طرح ماں اپنے بچے کو پیٹ میں لئے رہتی ہے اسی طرح سورۂ فاتحہ سارا قرآن اپنے اندر لیے ہوئے

ہے کیونکہ سارے قرآن میں یا تو منعم علیہم کا تذکرہ ہے یا مغضوبین اور ضالین کا تذکرہ ہے۔ سورۂ فاتحہ اجمال ہے اور قرآن اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ میں لفظ غیر فرما کر بتادیا کہ ان کا راستہ غیر صراط مستقیم ہے، نہ یہ میرے ہیں نہ ان کا راستہ میرا ہے، یہ غیر ہیں ان کا راستہ بھی غیر ہے۔ ان کے غیر ہونے کی علامت یہ ہے کہ ان پر میرے غضب کے آثار ہیں اور ان کا چال چلن ان کی گمراہی کا پتہ دیتا ہے۔ قرآن کا عجیب اعجاز ہے، جس طرح انعام والے بندوں کے خطابات اپنے اندر انعامات لیے ہوئے ہیں اسی طرح مغضوبین اور ضالین کے عنوانات عتاب اپنے اندر سزا اور عتاب بھی لیے ہوئے ہیں۔

نبوت اور رسالت کا انعام تو ختم ہو چکا ہے مگر اتباع سنت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے صدیقیت اور شہادت اور صلاحیت کے انعام کا دروازہ قیامت تک کے لیے کھلا ہوا ہے۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشان است
خم و خمخانہ بامہر و نشان است

ایک سوال اس مقام پر یہ پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ فاتحہ میں حق تعالیٰ نے منعم علیہم کا ذکر مغضوبین اور ضالین سے پہلے فرمایا ہے حالانکہ دفعِ مضرت کو جلبِ منفعت پر مقدم رکھا جاتا ہے۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ مغضوبین اور ضالین کے اوپر جو غضب اور ضلالت کے آثار ہیں ان کی شناخت اور ان کی مضرت کا احساس موقوف ہے کسی منعم علیھم کی صحبت اٹھانے پر۔ کفر اور شرک اور فسق کا قبیح ہونا نیک بندوں کی صحبت کے فیض ہی سے معلوم ہوتا ہے۔ جو کیڑا ہمیشہ نابدان میں پلا ہو اسے کیا خبر کہ باہر کیا ہے، اس کو نابدان کا گندا پانی ہی آبِ خوشتر اور آبِ حیات معلوم ہوتا ہے۔ پس کفر وشرک اور فسق کے ماحول

میں پرورش پایا ہوا انسان جب تک کسی مقبول بندے کی صحبت میں نہ بیٹھے گا اسے کیسے معلوم ہوگا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔ اسی کو حضرت عارف فرماتے ہیں ؎

کے دہد زندانی در اقتناص
مرد زندانی دیگر را اخلاص

جو خود علایق دنیویہ میں مبتلا ہو تو وہ دنیا کا شکار کردہ شخص دوسرے قیدی کو کب خلاصی دِلا سکتا ہے۔

جز مگر نادر یکے فردانئے
تن بزنداں روح او کیوانئے

مگر وہ نادر مقدس ذات جس کی روح میں حق تعالیٰ کے ساتھ ایک قوی رابطہ خاص قائم ہو اس کا جسم تو دنیا میں چلتا پھرتا ہو لیکن اس کی روح عالمِ قدس سے رابطہ رکھتی ہو ایسا شخص جب اللہ کی طرف پکارتا ہے تو اس کے کلام میں استحضار عظمتِ حق اور استحضار معیتِ حق کے انوار ہوتے ہیں جو دوسروں پر بدون اثر کئے نہیں رہتے ؎

شیخ نورانی زرہ آگہہ کند
نور را بالفظہا ہمرہ کند

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ نورانی مقبول بندہ جس کی صحبت میں تم بیٹھو گے وہ تمہیں حق تعالیٰ کے راستے سے آگاہ کرے گا اور اپنے قلب کے انوار کو اپنے الفاظ کے ہمراہ کرکے تمہارے دلوں میں پہنچادے گا۔

اسی لئے حق تعالیٰ نے منعم علیہم بندوں کو مغضوبین اور ضالین سے پہلے ذکر فرمادیا تاکہ ان مقبول بندوں کے انوار میں مغضوبین اور ضالین کی ظلمتوں کا ادراک اور شعور ہوجاوے۔ ظلمت کی معرفت موقوف ہے روشنی پر

تُعْرَفُ الْاَشْيَآءُ بِاَضْدَادِهَا ہر شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔اس وجہ سے موقوف علیہ کو مقدم فرما دیا گیا۔ نیز مقصود اصلی میں نفع ہوتا ہے دفعِ مضرت اس مقصود کے بقا کا ذریعہ ہوتا ہے۔ نسخے میں پہلے پرہیز نہیں لکھتے ہیں۔اوّلاً مفید دواؤں کو لکھتے ہیں پھر مضر غذاؤں سے پرہیز لکھ دیتے ہیں۔

اب ایک سوال اس مقام پر اور ہوتا ہے وہ یہ کہ مغضوبین اور ضالین میں یہود و نصاریٰ کو متعین کیوں فرما دیا، مشرکینِ عرب کا ذکر بھی ہونا چاہیے۔ مشرکین کا راستہ بھی صراطِ مستقیم سے دور کرنے والا ہے۔اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ میں علماء بہت بڑے بڑے تھے جن کی اتباع سے گمراہی کا قوی اندیشہ تھا۔حدیث شریف میں ہے:

﴿زَلَّةُ الْعَالِمِ زَلَّةُ الْعَالَمِ﴾

(مرقاۃُ المفاتیح، کتابُ العلم)

عالِم کی گمراہی عالَم کی گمراہی کا سبب ہوتی ہے، یہود اور نصاریٰ کی طرف ان کا علم داعی اور جاذب تھا نیز ان کے اندر کفر اور شرک بھی تھا اس لیے ضمناً سب اہل کفر اور شرک بھی مغضوبین اور ضالین میں داخل ہیں۔

انعام یافتہ بندوں کے راستے کو حق تعالیٰ نے صراطِ مستقیم فرمایا ہے اور انہیں کے راستے کو ایک جگہ اپنا راستہ بھی فرمایا ہے۔ارشاد فرماتے ہیں ۔

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾

(سورۃ الانعام، آیت: ۱۵۳)

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میرا رسول جس راستے کی طرف تمہیں پکارتا ہے یہ میرا ہی راستہ ہے اور بالکل سیدھا راستہ ہے پس تم لوگ اسی راستے کی اتباع کرو۔اس سیدھے راستے کے علاوہ اور بہت سے ٹیڑھے راستے بھی ہیں جن پر

مغضوبین اور ضالین چلتے ہیں ان راستوں کی اتباع مت کرنا ورنہ یہ راستے تمہیں میرے راستے سے دور کردیں گے۔ یہ ہمارا تاکیدی حکم ہے تاکہ تم احتیاط رکھو۔ اور ایک جگہ اسی سیدھے راستے کو رسول کی طرف نسبت فرما رہے ہیں:

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ﴾

(سورۂ یوسف، آیت: ۱۰۸)

اے ہمارے رسول آپ فرمادیجئے کہ یہ راستہ میرا ہے مگر یہ میرا راستہ ایسا راستہ ہے کہ میں اپنے راستے پر لاکر اللہ تک پہنچادیتا ہوں اور میں دیکھ بھال کر راستہ چلتا ہوں اور دوسروں کو بھی اسی طرح یعنی علیٰ وجہ البصیرۃ چلاتا ہوں، میں اپنے راستے کا صدق اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں، یہ راستہ میرے لیے نظری نہیں ہے حق تعالیٰ نے مجھ پر اس راستے کو اس قدر بدیہی اور واضح فرمادیا ہے کہ میں اپنے راستے کو اسم اشارۃ کے قریب یعنی هٰذِهٖ سے تعبیر کررہا ہوں یعنی جو تمہارے لیے نظری ہے وہ ہمارے لیے مثل محسوسِ خارجی کے ہے اور میری ذات ایسی بافیض ہے کہ میرے متبعین کے اندر بھی یہی بینائی میری اتباع کے فیض سے پیدا ہوگئی ہے۔

میں نے تلاوت اور تزکیۂ نفس اور تعلیمِ کتاب وحکمت کے انوار سے اپنے اصحاب کو بھی بینا کردیا ہے اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ اس بصیرت سے میرے متبعین بھی مشرف ہوگئے۔ اس منعم علیہ بندے کا یہ اعجاز ہے کہ اس کی صحبتِ پاک سے ایسے افراد جو کفر اور شرک کی گندگی میں ملوث تھے وہ صراطِ مستقیم پر دوسروں کو چلانے والے بن گئے۔ ہر صحابی ہدایت کا چراغ بن گیا۔

جہاں صراطِ مستقیم کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف ہے تو وہ باعتبار اصل موضوع لہٗ کے ہے یعنی بالمعنی الحقیقی اور منعم علیہم کی طرف نسبت بایں معنیٰ کہ وہ اس راستے پر چلاتے ہیں۔

کتاب کے اندر صراطِ مستقیم کا عنوان بتایا گیا ہے، صراطِ مستقیم کا معنون انعام یافتہ بندوں کے ساتھ چلنے سے حاصل ہوگا۔ صراطِ مستقیم کو پہلے بیان فرمایا ہے صراطِ مستقیم کو بتانے والے بعد میں بیان فرمائے گئے۔ نعمت کو مقدم بیان فرماتے ہیں تاکہ طبیعت میں انشراح اور خوشی پیدا ہو جاوے اور نعمت جن کے ذریعے سے ملے گی ان کو بعد میں بیان فرمایا تاکہ اس مسرت اور انتظار شوق کے سبب منعم علیہم کی اتباع آسان ہو جائے۔ قرآن کے لطائف کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا ہے۔

بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

پیاسا دریا کے کنارے پانی پیتا پیتا مر جائے گا لیکن دریا کا پانی اسی طرح جوش مارتا رہے گا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ عالمِ آخرت کا پل صراط اسی صراطِ مستقیم کی صورتِ مثالی ہے۔

پس جو لوگ دنیا میں صراطِ مستقیم پر چل رہے ہیں کل قیامت کے دن وہ لوگ بآسانی پل صراط کو عبور کر جائیں گے۔

اب حق تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ ہم سب لوگوں کو اللہ تعالیٰ صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں اور صراط مستقیم پر چلنے کے لیے منعم علیہم بندوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں اور صراط مستقیم ہی پر خاتمہ فرمائیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ

(صراطِ مستقیم کے متعلق حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دامت فیوضہم العالیہ صدر دارالعلوم کراچی کی رائے)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

بر صراطِ مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

پورے قرآن کا خلاصہ سورۂ فاتحہ ہے اسی لیے اس کا نام قرآنِ عظیم بھی ہے اور اس کا خلاصہ بندہ کی طرف سے ایک درخواست ہے اور وہ درخواست صراطِ مستقیم کی ہے۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ مقصود المقاصد تو رضائے حق یا جنت ہے درخواست اسی کی ہونا چاہیے تھی اس کے بجائے صراطِ مستقیم کی درخواست کو سب سے اہم قرار دے کر ہر نماز کی ہر رکعت میں پیش کرنے کی ہدایت کی گئی۔ وجہ یہ ہے کہ اس جہان میں جو چیز نقد حاصل ہوتی ہے اور اس کا حصول انسان کو بھی معلوم ہوسکتا ہے وہ صراطِ مستقیم ہی ہے۔ رضائے الٰہی اور حصولِ جنت امرِ مخفی ہے جو صراطِ مستقیم کے لیے لازم ہے اس لیے درخواست اس چیز کی پیش کی گئی جو اس جہان میں نقد ملتی ہے یعنی صراطِ مستقیم یہی اس جہان کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔ مگر افسوس ہے کہ نماز پڑھنے والے مسلمان بھی اکثر اس حقیقت سے واقف نہیں۔

مخدومی حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری دامت برکاتہم نے بڑا احسان فرمایا کہ اس موضوع پر ایک مختصر تصنیف میں ایک بے نظیر مضمون حوالہ قلم فرما کر رشد و ہدایت کا ایک عظیم دروازہ کھول دیا۔

مجھے اُمید ہے کہ اس رسالہ کو ہر دیکھنے والا اپنے قلب میں ایک نور محسوس کرے گا۔

واللہ الموفق والمعین

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

(۲۰/ صفر المظفر ۱۳۸۱ھ)

شراب کے حرام ہونے کا ثبوت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ جامع

نَحْمَدُهٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ اَمَّا بَعْدُ!

احقر جامع عرض کرتا ہے کہ عرصہ دو سال پہلے حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری کی خدمت میں ایک افسر صاحب حاضر ہوئے تھے اور انہوں نے حضرت والا سے سوال کیا تھا کہ بعض افسران مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ شراب کے متعلق جب قرآن کریم میں لفظ حرام نہیں آیا ہے تو پھر علماء اس کو کیوں حرام قرار دیتے ہیں۔ اس سوال کے جواب میں حضرت والا نے ایک مبسوط تقریر فرمائی اور قرآن کریم سے شراب کی حرمت کا بیّن ثبوت پیش فرمایا اور مجھ سے ارشاد فرمایا کہ یہ تقریر حق تعالیٰ کی طرف سے ایک انعام ہے اس کو ضبط کر کے شائع کر دینی چاہیے تا کہ ہمارے تمام وہ نادان مسلمان بھائی بھی آگاہ ہو جائیں جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ بحکم حضرت والا دامت برکاتہم یہ مسودہ تیار کیا گیا اور تیاری کے بعد افسر موصوف نے اس کی طباعت و اشاعت کا وعدہ کر کے اس مسودہ کو تقریباً دو سال تک اپنے پاس رکھا۔ لیکن موصوف اپنی کسی مجبوری کے سبب اس مضمون کو طبع نہیں کرا سکے۔ ہر چند کہ بعض احباب مخلصین، اس مضمون کی طباعت کے لیے مجھے بار بار اسی اثناء میں متوجہ کرتے رہے۔ لیکن ان دنوں کچھ ذہنی انتشار کے سبب اس امر کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ مگر جب حق تعالیٰ کی طرف سے کسی کام کا وقت آ جاتا ہے تو غیب سے اس کے اسباب اور دواعی بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ کل ۲۶؍رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ کو برنس روڈ کراچی سے میں اپنے ایک کرم فرما دوست کے ہمراہ گذر رہا تھا کہ

ان کے جاننے والے دو حضرات آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ قرآن کریم میں شراب کو کہیں حرام نہیں فرمایا گیا ہے۔ اس گفتگو سے قلب پر ایک چوٹ سی لگ گئی اور اپنی سستی پر سخت ندامت ہوئی۔ قلب میں اس شدید داعیہ اور اس چوٹ کو لیے ہوئے احقر نے حضرت والا پھولپوری سے عرض کیا کہ حضرت آج اس قسم کا واقعہ پیش آیا ہے جس سے میرے قلب پر شدید اثر ہے اور سخت بے چینی کے ساتھ یہ داعیہ پیدا ہو رہا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو شراب کے متعلق آپ کا مسودہ طبع کرا کے سارے ملک میں پھیلا دیا جائے۔ امید ہے کہ ان نادان مسلمانوں کو اس غلط فہمی سے متنبہ ہو کر شراب نوشی سے توبہ نصیب ہو جاوے یا کم از کم علم صحیح حاصل ہو جانے سے شراب حرام سمجھ کر اس کا ارتکاب کریں گے اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ عقیدہ تو درست رہے گا اور عقیدہ کی درستی سے بالآخر عذاب میں کچھ دن مبتلا ہونے کے بعد مغفرت کی امید ہے اور اس تقریر کا منشاء شراب نوشی پر جری کرنا نہیں ہے بلکہ ہمیں ان نادان مسلمانوں کو کفر سے بچانا مقصود ہے جو حرام کو حلال سمجھے ہوئے ہیں۔ عقائد کا متفقہ مسئلہ ہے کہ حرام جانتے ہوئے فعل حرام کا ارتکاب تو گناہ کبیرہ اور حرام ہے لیکن فعل حرام کو حلال سمجھ کر ارتکاب کرنا کفر ہے کیونکہ یہ شخص قانونِ شاہی کا تحریف کرنے والا ہے۔ حضرت والا پھولپوری دامت برکاتہم نے ارشاد فرمایا کہ رسالہ ہذا کی طباعت کا اب وقت معلوم ہوتا ہے۔ میاں جب چاہتے ہیں تو اسی طرح غیبی سامان پیدا فرمادیتے ہیں اور حضرت والا نے یہ بھی حکم فرمایا کہ اس واقعہ کو بھی جو رسالہ ہذا کی طباعت کا داعی اور سبب قریب ہوا ہے تحریر کر دیا جاوے حق تعالیٰ شانہٗ اس رسالہ کے نفع کو عام اور تام فرماویں، آمین۔

احقر جامع: محمد اختر عفا اللہ عنہٗ

(مورخہ ۲۷/ رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ بروز جمعہ)

قرآن پاک سے شراب کے حرام ہونے کا ثبوت

نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ اَمَّا بَعۡدُ!

فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ، بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ.

یَسۡأَلُوۡنَکَ عَنِ الۡخَمۡرِ وَالۡمَیۡسِرِ قُلۡ فِیۡھِمَا اِثۡمٌ کَبِیۡرٌ
وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثۡمُھُمَا اَکۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِھِمَا

(سورۃ البقرۃ، آیت:۲۱۹)

ترجمہ: لوگ آپ سے (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے) شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی ہیں اور لوگوں کو فائدے بھی ہیں اور گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔

ان آیتوں سے حق تعالیٰ شانہٗ نے بندوں کو مطلع فرمایا کہ شراب سے جتنا نقصان ہو جاتا ہے اتنا نفع نہیں ہوتا کیونکہ نفع تو عارضی ہے اور نقصان کی حد نہیں جب عقل زائل ہوگئی تو انسانیت کا شرف ہاتھ سے جاتا رہا۔ عقل ہی کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے پس شراب پینا گویا اپنی اس عزت اور شرافت کو اپنے ہاتھوں کھو بیٹھنا ہے۔ سب سے پہلے شراب کے متعلق یہی آیتیں نازل فرمائی گئیں۔ اب اگر کوئی سائنس دان یہ دعویٰ کرے کہ شراب میں نقصان سے زیادہ نفع ہے تو ہم اسے جاہل اور حقیقت سے بے خبر کہیں گے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ مخلوق کا علم خالقِ حقیقی کے علم کا مدمقابل نہیں بن سکتا۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَمَا اُوۡتِیۡتُمۡ مِنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡلًا﴾

(سورۃ الاسراء، آیت:۸۵)

اے لوگو! تمہیں علم قلیل عطا کیا گیا ہے۔ اور اپنے علم کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

﴿الا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ﴾
(سورۃُ الملک، آیت: ۱۴)

بھلا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے۔ دن رات کے مشاہدات شاہد ہیں کہ اہلِ سائنس آج جس تحقیق پر مطمئن ہیں چند دن کے بعد جب اپنی غلطی کا ان کو انکشاف ہوجاتا ہے تو اپنی سابقہ تحقیق کی خود ہی تردید شائع کرتے رہتے ہیں۔ برعکس خالقِ حقیقی کا علم احتمالِ خطا سے پاک ہے ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰہِ تَبْدِیْلاً﴾
(سورۃ الاحزاب، آیت: ۶۲)

اور تم اللہ کے دستور میں کبھی کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

ایک مومن کے لیے قرآن کا اتنا ہی فرمان کہ شراب میں اثم کبیر یعنی بڑا گناہ ہے شراب سے احتیاط کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ ہر گناہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کا منشاء حق تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔ اور ہر نافرمانی سببِ ناراضی ہے پس مومن اپنے اللہ کی ناراضی کو کب گوارا کرسکتا ہے۔ مومنین کاملین کی شان تو یہ ہے کہ:

﴿یَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰہِ وَ رِضْوَانًا﴾
(سورۃُ الفتح، آیت: ۲۹)

حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت ہمارے فضل کو اور ہماری خوشنودی کو ڈھونڈتے رہتے ہیں کہ ہم کون سا ایسا عمل اختیار کریں کہ ہمارا پروردگار حقیقی ہم سے خوش ہوجائے۔

قرآنِ حکیم نے شراب کے قلیل منافع کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے نقصانات کثیرہ کو بیان فرمایا ہے اور یہ اسلام کی بہت بڑی صداقت کا بین ثبوت ہے کہ اسلام مشاہدات کا انکار نہیں کرتا کیونکہ مشاہدات کا انکار کرنا باطل ہے۔

ان آیات مذکورہ کے بعد شراب کے متعلق حسب ذیل آیتیں نازل فرمائی گئیں:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ٥ إِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ٥﴾

(سورة المائدة، آیات: ۹۱-۹۰)

ترجمہ: اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں سواس سے بالکل الگ رہوتا کہ تم کوفلاح ہو شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے آپس میں عداوت اور بغض ڈال دے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے سواب بھی باز آؤ گے۔

آیاتِ مذکورہ بالا سے شراب کے متعلق مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱)......إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ: حق تعالیٰ اپنے مومنین بندوں کو اطلاع فرمارہے ہیں کہ تم کافروں کی ریت مت کرو یہ شراب اور جوا اور بت اور قرعہ کے تیر گندی باتیں اور شیطانی عمل ہیں۔

شراب کو جوا اور بت اور قرعہ کے تیر کے ساتھ ذکر فرما کر یہ بتادیا کہ شراب ایسی بری چیز ہے کہ جوا اور بت وقرعہ کے تیر جیسی بری باتوں میں صفِ اوّل کی چیز ہے شراب کو مقدم فرما کر اس کی زیادہ گندگی پر اشارہ فرمادیا۔

مسلمانو! غور کرو کہ شراب کو حق تعالیٰ نے بت پرستی کے ساتھ ذکر فرمایا ہے تاکہ اور نفرت پیدا ہو کہ یہ فعل کفر سے قریب ہے کیونکہ شراب نماز سے جو کہ اعظم شعار اسلام اور علامات ایمان سے ہے روک دیتی ہے جب اس طور پر ایمان سے بُعد ہوا تو کفر سے قرب ہوا۔

(۲)......رِجْسٌ: شراب کو حق تعالیٰ شانہ نے رجس فرمایا ہے یعنی شراب گندی چیز ہے۔ سبحان اللہ کیا نفسیاتی علاج فرمایا ہے۔ طبعی نفرت کے بعد اب آگے شراب کی اور مضرتوں کو بغور سننے اور ماننے کی استعداد پیدا فرمادی قرآن کی حکمت و بلاغت کا ہم احاطہ ہی نہیں کر سکتے۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

(۳)......مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ: شراب شیطانی عمل ہے۔ مسلمانو! غور کرو کہ ہم مومن ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ہمارا ایمان ہے اور خدا تعالیٰ جس چیز کو شیطانی عمل فرما رہے ہیں اس کو ہم جائز کرنے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ دعویٰ اطاعت کا اور عمل بغاوت کا۔ حق تعالیٰ شانہ نے شراب کو شیطانی عمل فرما کر یہ بتادیا کہ جس طرح شیطان خدا کی نافرمانی اور سرکشی سے مردود ہوا ہے شراب کے اندر بھی یہی خاصیت ہے یعنی شراب نوشی سے تمہارے اندر طغیانی اور بغاوت و نافرمانی کا مادہ پیدا ہوگا اور انجام کار مسلسل نافرمانیوں کی نحوست سے شیطان کی طرح مردود ہوجانے کا اندیشہ ہے۔

(٤)......فَاجْتَنِبُوْهُ: سو اس سے الگ رہو مسلمانو! حق تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ شراب سے الگ رہو اور امر کا صیغہ استعمال فرمایا ہے جس سے شراب نوشی سے سخت پرہیز کا حکم ثابت ہورہا ہے۔ اب ہر مسلمان غور کرسکتا ہے کہ شراب سے الگ رہنے کا صاف حکم جو ہورہا ہے اس سے کیا کوئی اور مفہوم ہوسکتا ہے جیسا کہ بعض نادان یہ سمجھتے ہیں کہ شراب نوشی کی وہ مقدار حرام ہے جو نشہ آور ہو آیاتِ قرانیہ میں آخر کہاں سے اس کا ثبوت موجود ہے کیا وحیِ الٰہی کے مقابلہ میں اپنی رائے کو استعمال کرنے کا حق کسی کو حاصل ہے؟

(٥)...... لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: تاکہ تم کوفلاح ہو۔ مسلمانو! حق تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ تمہاری فلاح اسی میں ہے کہ تم شراب سے الگ رہواس کے قریب بھی نہ جاؤاورہم آج اپنی کامیابی اورترقی کارازشراب نوشی میں منحصر سمجھے ہوئے ہیں۔

مسلمانو! یقین کرلوکہ جب تک اسلامی معاشرہ نہ اختیار کیا جاوے گا ہمیں کبھی فلاح حاصل نہیں ہوسکتی۔حق تعالیٰ اپنی رحمت سے حکمران مملکت اسلامیہ پاکستان کوتوفیق عطا فرمائیں کہ پورے ملک میں شراب خانوں کا بالکلیہ قلع قمع کردیں۔

(٦)...... إِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبُغْضَآءَ فِيْ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ: شیطان شراب کے ذریعہ تمہارے آپس میں عداوت اور بغض پیدا کرتا ہے اور تمام عقلاءِ زمانہ کواس امر پراتفاق ہے کہ کسی قوم کو بدون آپس میں اتحاد کے سربلندی اور کامرانی میسرنہیں ہوسکتی ہے۔پس ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے گریبان فکر میں سرڈال کراپنے خوابیدہ ضمیر کوذرا بیدار کرکے غور کریں کہ ہم کس منہ سے قوم کی بہی خواہی کا دعویٰ کرتے ہیں جبکہ قرآن شراب نوشی کوسببِ نااتفاقی قراردیتا ہے۔ہم اپنی زبانوں سے تورات دن اتحاداتحاد کا شور برپا کئے ہوئے ہیں اوراتحاد میں خلل انداز ہونے والی مصیبت یعنی شراب نوشی اورشراب خانوں کے انسداد کا کوئی حل سوچنے کے بجائے اس کو جائز کرنے کی تدبیروں میں مشغول ہیں۔اے اللہ! ہمارے اوپرحق واضح فرمااور باطل سے اجتناب کی توفیق نصیب فرما،آمین۔

(٧)...... وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ: شیطان شراب کے ذریعے تم کواللہ تعالیٰ کی یادسے اورنماز سے بازرکھنا چاہتا ہے۔

مسلمانو!غورکروکہ قرآن کیا پیغام دے رہا ہے کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ تم اپنے پروردگارِحقیقی کی یادسے غافل کردیئے جاؤاورتم نماز سے روک دیئے

جاؤ کوئی مسلمان اس کو ہرگز پسند نہیں کرسکتا۔ پھر شراب نوشی کو ہم کیوں گلے لگا رہے ہیں اور شراب خانوں کی ترویج پر پابندی کیوں عائد نہیں کررہے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم کو اپنے اللہ کی یاد سے اور نماز سے وہ لگاؤ نہیں ہے جیسا کہ ہونا چاہیے ورنہ یہ ممکن نہیں کہ جو شے ہم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے اسے ہم ترک نہ کریں۔

(۸)...... فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ: سواب بھی باز آؤ گے۔ قرآن کا یہ عنوان شراب سے کس درجہ متنفر کررہا ہے۔ یہ عنوان ایک مشفق استاد اور ایک مشفق باپ اس وقت اپنے شاگرد اور اولاد کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔ جبکہ وہ استاد اور باپ اپنی پوری دلسوزی کے ساتھ کسی بری عادت کے نقصانات پر تنبیہ کرچکتا ہے پھر اس کے بعد کہتا ہے اتنی مضرتوں کے علم ہوجانے کے بعد اب تو باز رہو گے اب تو سمجھ میں آ گیا ہوگا۔ اسی طرح حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے بندوں کو جب شراب کے متعلق اتنے نقصانات سے آگاہ فرمادیا کہ (۱) شراب اس قدر گندی چیز ہے کہ اس کا تذکرہ جوا اور بت اور قرعہ کے تیر کے ساتھ صف اوّل کا درجہ رکھتا ہے۔ (۲) شرب گندی چیز ہے۔ (۳) شراب شیطانی عمل ہے۔ (۴) شراب نوشی سے اجتناب کا حکم دیا ہے۔ (۵) شراب نوشی کے ساتھ تم کو فلاح میسر نہیں ہوسکتی ہے۔ (۶) شراب کے ذریعہ شیطان تمہارے آپس میں دشمنی پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ (۷) شراب کے ذریعہ شیطان تم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اتنے مفاسد اور نقصانات سے آگاہ کرنے کے بعد اب فرماتے ہیں۔ (۸) فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ سواب بھی باز آؤ گے۔

ہر مسلمان غور کرسکتا ہے کہ قرآن کی مذکورہ بالا آیتوں سے شراب کا حلال ہونا ثابت ہوتا ہے یا حرام ہونا؟ کیا کسی جائز اور حلال شے سے بھی الگ رہنے اور باز آجانے کی ہدایت کی جاتی ہے؟ کیا قرآن نعوذ باللہ کسی مجنوں کا

کلام ہے؟

بریں عقل و دانش بباید گریست

ترمذی شریف میں روایت ہے کہ یعنی فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ کو (سو اب بھی باز آؤ گے) جب حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے سنا تو سنتے ہی عرض کیا اِنْتَهَيْنَا یعنی ہم باز آئے اور بخاری شریف میں یہ بھی روایت ہے کہ اس وقت جتنی شرابیں موجود تھیں سب پھینک دیں اور جن برتنوں میں شراب پیا کرتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان برتنوں میں شربت رکھنے کو بھی منع فرمادیا تاکہ شراب سے دلوں میں سخت نفرت پیدا ہو جائے۔

بعض نادان یہ کہتے ہیں کہ قرآن شریف میں شراب کے متعلق لفظ حرام موجود نہیں ہے حالانکہ جب شراب کے متعلق قرآن میں (۱) ناپاک ہونا (۲) شیطانی عمل ہونا (۳) اثم کبیر یعنی گناہ کبیرہ ہونا (۴) بت پرستی کے ساتھ مذکور ہونا (۵) فَاجْتَنِبُوْهُ کے صیغۂ امر سے شراب سے بچنے کا حکم فرمانا ثابت ہو چکا تو اب لفظِ حرام کی تلاش محض شیطانی اور نفسانی کجروی اور حیلہ سازی ہے۔ عقلِ سلیم اور طبیعتِ سلیمہ کے لیے زجر اور ممانعت کے اتنے عنوانات کافی وافی ہیں۔

میں ایک روز تلاوت کر رہا تھا کہ حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے لفظ حرام سے شراب کا حرام ہونا ثابت ہونا بھی دل میں القاء ہوا۔ میں نے اپنے چند اہلِ علم احباب کو جب اس استدلال کو سنایا تو بہت محظوظ ہوئے۔ وہ استدلال یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے سورۂ اعراف میں ارشاد فرمایا ہے۔

﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾

(سورۃ الاعراف، آیت: ۳۳)

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ البتہ میرے رب نے صرف حرام کیا ہے تمام فحش باتوں کو ان میں جو علانیہ ہیں وہ بھی اور ان میں جو پوشیدہ ہیں وہ بھی اور ہر گناہ کی بات کو اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو۔

اب غور سے سمجھنا چاہیے کہ اس مقدمہ اولیٰ کو باعتبار فنِ منطق کے صغریٰ کہتے ہیں۔

اب دوسرا مقدمہ جو دوسری آیت سے ثابت ہے۔ فِيهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ اس کو مقدمہ ثانیہ اور منطق میں کبریٰ کہتے ہیں اب ان دونوں کو ملانے سے نتیجہ باعتبار شکلِ اوّل کے یہ نکلا کہ شراب حَرَّمَ رَبِّیُ کے تحت داخل ہے۔

مضمون بالا کو اب آسان زبان میں یوں سمجھئے کہ ایک آیت میں حق تعالیٰ شانہٗ نے وَالْاِثْمُ کو حَرَّمَ رَبِّیُ کے تحت حرام فرمایا ہے قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَيْرِ الْحَقِّ اور ایک آیت میں شراب کے اندر اِثْمٌ كَبِيْرٌ کو ثابت فرمایا قُلْ فِيهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ پس جب کہ حق تعالیٰ نے اثم کو حرام فرمایا ہے تو جس شے کے اندر اِثْمٌ كَبِيْرٌ کا ہونا ارشاد فرمایا ہے اس کی حرمت صراحت کے ساتھ حرمت کبیرہ ثابت ہوتی ہے اور یہ اس قدر واضح استدلال ہے کہ اس میں ذرا بھی خفا نہیں ہے نیز یہ کہ شراب کے متعلق اِثْمٌ كَبِيْرٌ کی تنوین بھی تعظیم کے لیے ہے جس سے شراب کا دیگر تمام بڑے بڑے گناہوں سے سنگین قسم کا گناہ کبیرہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

پس جب شراب کی شدت حرمت آیات مذکورہ سے ثابت ہے تو پھر اس کی حرمت میں نفسانی تاویلیں کرنا اور حیلہ سازی کرنا سخت خطرناک گناہ ہے یعنی یہ اس قدر شدید قسم کی گستاخی اور نافرمانی ہے جس کے موجب کفر ہونے کا خوف ہے کیونکہ عقائد کا مسئلہ ہے کہ نصوص کا انکار کرنا کفر ہے اور یہاں بھی اس قسم کی لچر تاویلیں شراب کو جائز کرنے کے لیے استعمال کرنا رد النصوص کے

مترادف ہے۔لہٰذا شراب پینا، پلانا، پلانے میں مددگار بننا، خریدنا اور بیچنا سب حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو پناہ میں رکھیں اور ہمارے اوپر حق کو واضح فرمادیں، آمین۔

مسلمانو! آج جو لوگ شراب کو حلال بنانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ سمجھ لیں کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے اس امر کی پیشن گوئی فرمادی تھی کہ:

﴿لَيَكُوْنَنَّ مِنْ اُمَّتِیْ أَقْوَامٌ يَّسْتَحِلُّوْنَ الْحِرَ وَالْحَرِيْرَ وَالْخَمْرَ وَالْمَعَازِفَ﴾

(صحیحُ البخاری، کتابُ الاشربة، باب فیمن یستحل الخمر ویسمیه بغیر اسمه)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ عنقریب میری امت میں ایسی قوم پیدا ہوگی جو زنا ریشم اور شراب اور باجوں کو حلال سمجھے گی۔ پس بہت ڈرنے کا مقام ہے۔

قال العارف الرومی رحمۃ اللہ علیہ ؎

از شراب قہر چوں مستی دہد
نیست ہا را صورت ہستی دہد

حق تعالیٰ ہماری عقول کو شرابِ قہر کی مستی سے محفوظ فرمائیں اور ہمیں صحیح فہم عطا فرمائیں۔